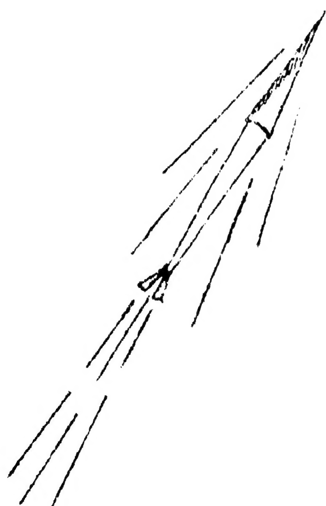
مریخ کی سیر



شوکت تھانوی

۱۹۵۷ء

قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے

ناشر
مکتبہ
کلیاں
لکھنؤ

پرنٹر
سرفراز
قومی پریس
لکھنؤ

ٹیلیفون ۵۷۲۵

مریخ کی سیر

آج ۷؍ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ۷؍ دسمبر ۲۰۵۷ء سمجھ کر میری آج کی ڈائری پڑھو کہ صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ مریخ یونیورسٹی سے میرے دونوں بچے چھٹیاں منانے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے فوراً ان دونوں کو بلایا۔ ان کے ساتھ ایک مریخی دوست بھی آیا ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ لڑکا خالص مریخی باشندہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا تمام جسم مچھلی کی طرح کا تھا۔ اور سر بھی اس دنیا کے باشندوں سے الگ بندر اور بلی کی درمیانی وضع کا تھا۔ میرے بچے آتے ہی مجھ سے لپٹ گئے۔ اور اس مریخی لڑکے نے مجھ کو نہایت ادب کے ساتھ مریخ کے قاعدے سے اپنی دُم ہلا کر سلام کیا۔ میرے بچے اپنے اس دوست کا تعارف مجھ سے کرانا ہی چاہتے تھے کہ میں نے خود مریخستانی زبان میں اس سے اس کا نام پوچھا اور اس نے نہایت سلیس دنیاوی زبان میں اپنا نام ”ترنگول“ بتایا جس کے معنی مریخستانی زبان میں شہرت کے ہوتے ہیں۔ میرے لڑکے نے اپنے اس دوست کی مزید تعریف کرتے ہوئے کہا۔ یہ یونیورسٹی میں ہم دونوں بھائیوں کے تنہا دوست ہیں اور ہم تینوں ایک ہی کمرے میں

رہتے ہیں۔ ان کے والد مریخ کے ملک "شششاشہ" کے شہر "دغدغہ" میں راکٹ بنانے کا کارخانہ کھولے ہوئے ہیں اور اس مرتبہ ہم لوگ اسی کارخانہ کے راکٹ پر یہاں تک آئے ہیں۔

میں نے نہایت دلچسپی سے یہ حالات سنے اور اپنے بچوں سے کہا۔ کہ ترنگول سلمہ کو اپنی امی سے بلا ڈ غالباً وہ آگئی ہوں گی۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ آج خلاف معمول اب تک واپس نہیں آئی ہیں۔ حالانکہ جب سے ڈاکٹر نے سمندری آب و ہوا میں رات بسر کرنے کی ان کو ہدایت کی ہے۔ ان کا معمول یہی رہا ہے کہ وہ رات کو کھانا کھا کر آٹھ بجے لکھنؤ سے چل کر نو بجے بمبئی پہونچ جاتی ہیں۔ اور تمام رات ساحل پر گذار کر صبح کی چائے پھر لکھنؤ ہی میں پیتی ہیں۔ مگر آج چائے کے وقت پر موجود نہیں۔ لہذا مجھ کو قدرتی طور پر فکر تھی۔ کہ آخر قصہ کیا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں ان کے متعلق پوچھ گچھ شروع کروں ہیلی کوا پٹر کی سنسناہٹ سنائی دی اور فوراً ہی وہ مسکراتی ہوئی کمرہ میں داخل ہو گئیں۔ دونوں بچے دوڑ کر ان سے لپٹ گئے اور مریخی لڑکے نے نہایت تعظیم سے دم ہلا کر ان کو سلام کیا۔ میں نے دیر میں آنے کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ چند منٹ کے لئے بھوپال میں اتر گئی تھیں۔ بہرحال میں نے بٹن دبا کر اپنی مسہری کو میز کی صورت میں منتقل کر دیا۔ اور گرم شعاعیں پھینکنے والی ٹارچ دکھا کر ٹھنڈے پانی کو فوراً اُبال دیا۔ میں تو اس وقت چائے کے ساتھ صرف دو بسکٹ کھاتا ہوں۔ مگر بچوں کو ذرا اچھے ناشتے کی ضرورت تھی۔ لہذا میں نے ایک شیشی سے دو دو گولیاں نکال کر دونوں بچوں کو اور ان کے مریخی دوست کو

دے دیں۔ چنانچہ بچوں نے گولیوں کو اپنی اپنی پلیٹ میں رکھ کر جیسے ہی پانی کا چھینٹا دیا وہ پھول کر دو خوبصورت اور مزیدار کیک بن گئیں۔ مگر اس وقت ایک مصیبت یہ تھی کہ آدمی تھے پانچ اور میرے یہاں جو مرغی تھی۔ وہ میری ضرورت کے مطابق صبح کے وقت چار ہی انڈے دیتی تھی۔ دو میں کھاتا تھا اور دو بیگم۔ لیکن جب بچے آجاتے تھے تو سب ایک ایک۔ مگر آج ان چار کو پانچ بنانا کیونکر ممکن تھا۔ میں اسی فکر میں تھا کہ بیگم نے مسکرا کر کہا کہ آپ انڈوں کے متعلق فکر نہ کریں۔ میں بھوپال سے ناشتہ کر کے آئی ہوں۔ البتہ کل کے لئے یہ انتظام کرنا ہوگا کہ مرغی کو پانچ انڈے دینے والی دوا آج ہی رات کو پلا دی جائے۔ بہرحال اس وقت انڈوں کا مسئلہ حل ہو گیا اور کوئی بے لطفی پیدا نہ ہو سکی۔ ہم لوگ ابھی چائے سے اٹھے ہی تھے کہ گھنٹی بجی۔ اور اب جو میں آئینہ دیکھتا ہوں تو میرے ایک کناڈا کے دوست کا چہرہ نظر آیا۔ میں نے فوراً ایک بٹن دبا دیا جس سے ڈرائنگ روم خود بخود کھل جاتا ہے۔ دراصل یہ آئینہ جس میں میرے دوست کا چہرہ نظر آیا تھا بڑی عمدہ چیز ہے۔ اس کے ساتھ کا ایک آئینہ باہر لگا ہوا ہے۔ چنانچہ جو کوئی بھی اس آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اس کا عکس اس کے اندر والے آئینہ میں فوراً آجاتا ہے۔ اور گھنٹی بجتی ہے۔ اس طرح نہ کسی کو آواز دینے کی ضرورت نہ وزٹنگ کارڈ بھیجنے کی ضرورت۔ بہرحال ان دوست کے آنے کی اطلاع پا کر میں نے فوراً بجلی کا لیف اپنے چہرے پہ پھیرا جس سے ایک سکنڈ میں داڑھی بن جاتی ہے۔ اس کے بعد میں اس الماری میں گھس گیا

جو ڈیڑھ منٹ میں کپڑے پہنا دیتی ہے۔ آخر کار میں نے وہ ٹوپی پہن لی جو اوپر سے
ٹوپی ہے اور اندر ہی اندر بالوں میں کنگھی کرتی رہتی ہے تاکہ جب ٹوپی اتاری جائے
تو بال بنے ہوئے نکلیں۔ بہر حال میں فوراً ڈرائنگ روم میں پہونچا اور اپنے دوست
سے ملا۔ وہ آج ہی فضائی بائیسکل پر کناڈا سے آئے تھے اور شام تک واپسی کا
ارادہ تھا۔ ان کے آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ریڈیو پر انھوں نے جو تقریر
کی تھی اُسی کو خود سننے ہندوستان میں ان کی آواز کیسی آئی۔ میں نے
ان سے کہا کہ پہلے اس کو مذاق سمجھا جاتا تھا کہ ایک آدمی خود اپنی آواز
کسی دوسری جگہ سے سُنے۔ مگر آج سائنس کی ترقی نے اسی مذاق کو واقعہ
بنا دیا ہے۔ میرے دوست ہنسنے لگے۔ اور لاپرواہی سے کہا "جی ہاں
وہ جہالت کا زمانہ تھا۔ اس وقت یہ معمولی سی بات کس کی سمجھ میں آتی تھی
کہ دن میں دو تین مرتبہ ایک شخص کناڈا سے ہندوستان تک آجا سکتا
ہے۔ لوگ افیونیوں کی طرح اونگھ اونگھ کر مہینوں میں یہ سفر طے کرتے تھے۔
گویا یہ سفر زہرہ اور مشتری کا سفر تھا۔ موٹر ایسی سست رفتار سواری پر
اس زمانہ کو ناز تھا۔ اور ہوائی جہاز گویا معجزہ کا درجہ رکھتے تھے۔ میں نے
ان کو دن کے کھانے کی دعوت دی۔ مگر ان کو عذر یہ تھا کہ دن کا کھانا
مدراس کے ایک دوست کے ساتھ کھانا ہے۔ اور رات کو کراچی میں ڈنر
ہے۔ میں بھی اس سلسلہ میں اصرار نہ کر سکا۔ اور چند منٹ تک اِدھر اُدھر
کی باتیں کرنے کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد
مجھ کو بھی دفتر جانا تھا۔ لہذا میں نے فوراً اپنے بازوؤں میں پر لگائے اور

تیسری منزل پر پہونچ کر دفتر کی جانب اڑ گیا۔ مجھ کو ان پروں سے بڑا آرام ملتا ہے۔ اور بہت جلد دور دراز راستہ طے ہو جاتا ہے۔ تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح آجکل غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ یہ پر رکھتے ہیں اسی طرح اگلے زمانے میں لوگ پیر گاڑی رکھا کرتے تھے جس کو سائیکل کہتے تھے۔ اور اس پر بیٹھ کر عام انسانی رفتار سے ذرا تیز رو ہو کر اپنا راستہ طے کیا کرتے تھے۔ عجیب زمانہ تھا وہ بھی جب زمین اس قدر فالتو تھی کہ اس پر سڑکیں بنائی جائیں اور فضا کو بالکل خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جو در اصل انہی کاموں کے لئے بنائی گئی ہے۔ بہر حال میں چند سکنڈ میں فضا میں اڑتا ہوا دفتر پہونچا۔ میرے دفتر میں سوائے میرے اور کوئی انسان نوکر نہیں ہے البتہ مجھ کو پانچ مشینیں ماتحت کے طور پر دی گئی ہیں۔ ایک مشین تمام خط و کتابت کرتی ہے۔ دوسری مشین حساب کتاب کی ذمہ دار ہے۔ تیسری مشین کے سپرد مختلف کام ہیں۔ مثلاً دفتر کی صفائی کاغذات کی ترتیب۔ جلد سازی اور دفتری کے تمام کام کے لئے چوتھی۔ پانچویں مشین گویا میرے بعد دفتر کی سب سے بڑی حاکم ہے۔ اس لئے کہ اس مشین سے ان تمام مشینوں کی نگرانی ہوتی ہے جو دفتر میں کام کرتی ہیں۔ اور یہی مشین ان تمام مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ اور خرابیوں کو دور کرتی رہتی ہے۔ میرا کام صرف اس قدر ہے کہ میں ضروری کاغذات پر دستخط کرتا ہوں اور اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے بٹن دبا کر ان تمام مشینوں سے کام لیتا رہتا ہوں۔ مثلاً کسی خط کا جواب دینے والی مشین کا بٹن دبا کر جواب بولنا شروع کر دیا۔ اور وہی جواب باقاعدہ دفتر کے لیٹر پیپر پر (خط لکھنے کا کاغذ) لکھا ہوا

مع ایک نقل کے میرے دستخط کے لئے آجاتا ہے۔ اسی طرح رجسٹروں میں جو ضروری اندراج ہوتے ہیں وہ بھی بٹن دبا کر میں بولتا جاتا ہوں اور اندراج ہوتا جاتا ہے۔ ڈاک آنے اور ڈاک جانے کے بھی یہی طریقے ہیں کہ خط لکھنے والی مشین خط اور لفافہ لکھ کر میرے دستخط کے بعد لفافہ بند کر کے خود ہی اس لیٹر بکس میں ڈال دیتی ہے۔ جو دفتر میں لگا ہوا ہے۔ ان خاص مشینوں کے علاوہ پانی پلانے اور سگریٹ پلانے۔ دروازہ کھولنے اور دروازہ بند کرنے اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے نئی مشینیں لگانا پڑتیں۔ مگر یہ کام بھی انھیں مشینوں پر تقسیم کر دیے گئے ہیں اور میں خوش اور مطمئن ہوں کہ میرے ماتحت انسانی ہاتھوں سے کہیں زیادہ سلیقے اور ٹھیک طریقے سے اپنے تمام فرائض انجام دیتے ہیں۔ البتہ ہر اتوار کو ایک انجینیر آتا ہے اور ان تمام مشینوں کو ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔

میں نے حسب معمول ڈھائی گھنٹے تک کام کیا اور پھر اپنے پروں سے اڑتا ہوا گھر آگیا۔ گھر آکر معلوم ہوا کہ بیگم کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ لہذا فوراً ان کے پاس پہونچا۔ دونوں بچے اور ان کا مریخی دوست وہیں موجود تھے۔ میرے بڑے لڑکے نے مجھ کو دیکھتے ہی کہا کہ میں سیارہ زحل کے ڈاکٹر ڈوبال کو ٹیلیفون پر اس کی والدہ کا پورا حال سنادوں۔ اور جو دوا وہ تجویز کریں اس کا استعمال شروع کیا جائے۔ مجھے اس کی رائے پسند آئی۔ اور میں نے فوراً ٹیلیفون کا سلسلہ سیارہ زحل سے ملا کر ڈاکٹر ڈوبال سے زحلی زبان میں مریضہ کا پورا حال کہا۔ ڈاکٹر نے نہایت غور سے تمام حال سن کر یہ تجویز

کیا کہ میں بیگم کو زحل کے مشہور چشمہ عقازیہ کا پانی دن کو کم سے کم چار مرتبہ پلاؤں۔
اور ہفتہ میں ایک مرتبہ اسی پانی سے غسل ہو۔ یہ پانی ہماری دنیا میں بھی مشہور
دوا فروشوں کے یہاں ملتا ہے لہذا میں نے اسی وقت اس کا انتظام کر دیا
اور اب امید ہے کہ بیگم کو اختلاج کبھی نہ ہوگا۔ میرے بچوں کا مریخی دوست
بیان کرتا ہے کہ اس کی بہن کو بھی ڈاکٹر ژوبال کے علاج سے بہت جلد
فائدہ ہوگیا تھا۔ مگر اس کے لئے مریخ کی آب و ہوا کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر
ژوبال نے ہماری دنیا کی ایک دوا تجویز کی تھی۔ یعنی ہمالیہ کی برف۔ بہرحال
یہ طے ہے کہ ڈاکٹر ژوبال اپنے فن میں نہایت قابل ڈاکٹر ہے اور سنا ہے کہ وہ
دس دس برس کے مرے ہوئے لوگوں کو زندہ کر دینے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ خیر
ایسے ڈاکٹر تو ہماری دنیا میں بھی ہیں جو ایک جسم کی روح دوسرے جسم میں تبدیل
کر دیں۔ مگر زحل کا یہ ڈاکٹر اپنا آپ ہی جواب ہے۔ ابھی چند دن ہوئے کہ
میرے ہی ایک عزیز فضا میں اپنے پر ٹوٹ جانے کی وجہ سے گر کر مرے اور
ان کو دیکھ کر ایک دوسرا اچھا بھلا آدمی قلب کی حرکت بند ہو جانے سے
مر گیا۔ چنانچہ ہماری دنیا کے مشہور ڈاکٹر عظمت نے میرے عزیز کی روح
اس آدمی کے جسم میں تبدیل کر کے ان کو زندہ رکھا۔ ہرچند کہ وہ صورتاً تو
مر گئے مگر روحانی طریقہ پر اب اس دوسرے شخص کی صورت میں زندہ ہیں
اور اس شخص کے عزیز بھی مطمئن ہیں کہ گو ان کا عزیز روحانی طریقہ پر مر گیا ہے
مگر جسمانی طریقہ پر زندہ ہے۔ مگر سیارہ زحل کے ڈاکٹروں نے جو ترقی کر لی ہے
اس کے مقابلے میں یہ کمالات بچوں کے کھیل سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ بیگم کو

اس چشمہ کا پانی پیتے ہی سکون ہوگیا۔ اور وہ بظاہر بالکل تندرست معلوم ہوتی ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے بچوں کو ان کے مریخی دوست کے ساتھ لے کر ذرا نیویارک میں سینما دیکھ آؤں وہاں آج بہت عمدہ فلم آیا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ اس فلم میں جو باغات دکھائے گئے ہیں ان کے پھولوں کی اصل خوشبو آتی ہے اور ان کے پھلوں کو اگر دیکھنے والے کھانا چاہیں تو ان کو بالکل اصلی پھلوں کا سا مزہ آتا ہے۔ بلکہ انھیں پھلوں کی ڈکاریں بھی آتی ہیں۔ یہ دراصل فلم سازی کی صنعت کا کمال ہے۔ جس کا خیال بھی اگلے زمانے کے لوگ مشکل سے کر سکتے تھے۔ سینما والوں نے لکھ دیا ہے کہ تماشائی کھانا کھا کر نہ آئیں۔ ورنہ وہ پھل نہ کھا سکیں گے۔ لہذا میں بھی آج رات کا کھانا غائب کئے دیتا ہوں۔ مگر وہاں جانے سے قبل مجھ کو غسل کرنا ہے۔ اور لباس بھی تبدیل کرنا ہے۔ خیر یہ تو چند منٹ کا کام ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی اگلے زمانے کا غسل تو ہے نہیں کہ لباس اتار کر انسان غسل خانے میں جائے اور وہاں ٹب میں بیٹھ کر نہائے۔ اب تو لباس پہنے پہنے چلتے پھرتے غسل ہو سکتا ہے۔ نہ صابن ملنا نہ جسم خشک کرنا اور نہ اپنے اوپر پانی بہانا۔ بس گیس کا ٹیوب کپڑوں کے نیچے اور جسم کے اوپر رکھا اور مکمل غسل ہوگیا۔ رہ گیا کپڑے بدلنا اس میں بھی کونسا پہاڑ کھودنا ہے۔ کپڑوں کی الماری میں گھسے اور ایک لباس اتر کر دوسرا خود بخود جسم پر آجاتا ہے صرف لباس پسند کرنے میں دیر لگتی ہے۔ بہرحال مجھ کو نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں مشکل سے دس سکنڈ لگیں گے۔ اس کے بعد سہ پہر کی چائے ہوگی۔ اور پھر ہم سب نیویارک روانہ ہوجائیں گے۔

وہاں سے واپسی پر بیگم کو بمبئی اتارتا ہوا میں سب کو لے کر لکھنؤ آ جاؤں گا۔ میں تو سینما نہ جاتا مگر بچے چھٹیاں منانے آئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کی تفریح بھی ضروری ہے۔ آج یہ سینما کا پروگرام بن گیا۔ کل سنا ہے کہ دہلی میں فٹ بال ٹورنمنٹ کا فائنل میچ ہے۔ جس میں چاند کی ٹیم اور مشتری کے مشہور کھلاڑیوں کا زبردست مقابلہ ہے اور بہت سے سیاروں کے لاکھوں آدمی اس میچ کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ مجھے فٹ بال سے تو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ مگر اس موقع پر جو مجمع ہوگا وہ بجائے وہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ مختلف دنیاؤں کے باشندوں سے ملاقات ہوگی۔ اور عجیب عجیب حلیوں و شکلوں کے لوگ نظر آئیں گے۔ پرسوں چاند گرہن ہے۔ اور میرا ارادہ ہے کہ میں چاند میں جا کر گرہن کے وقت دنیا کا حال دیکھوں غالباً بچے بھی اس پروگرام کو پسند کریں گے۔ یہ تفریح کی تفریح ہے اور بچوں کیلئے ایک اچھا تعلیمی مشغلہ بھی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر امکانی کوشش کروں گا کہ بچوں کی چھٹیوں کا زمانہ دلچسپی سے خالی نہ گذرے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے مریخی دوست کی تفریح بھی ہو جائے۔

(۲)

آج ۱۲ر دسمبر ۲۰۵۷ء ہے اور میرے دونوں بچے مع اپنے مریخی دوست کے واپس جانے والے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلوں اور میں خود بھی چاہتا ہوں کہ مریخ کی اس عجیب و غریب دنیا کی سیر کر آؤں جس کے واقعات اس دنیا کے لوگ حیرت سے منہ کھول کھول کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنتے ہیں۔ دوسرے اسی بہانے سے بیگم کی تبدیل آب و ہوا بھی ہو جائیگی

حالانکہ وہ راکٹ کے سفر سے اسی طرح ڈرتی ہیں جس طرح اگلے زمانے کی بہو بیٹیاں ہوائی جہاز سے ڈرا کرتی تھیں۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ مریخ کے اس سفر کے بعد راکٹ کے سفر سے وہ نہ گھبرائیں گی۔ بہرحال میں نے تمام دن اپنا سامان سفر درست کیا اور سہ پہر کو اپنے دونوں بچوں کو معہ ان کے مریخی دوست ترنگول سلمہٗ اور بیگم کے راکٹ سے مریخ کی طرف اڑ گیا۔ ہماری دنیا اور مریخ کا فاصلہ تو خیر بہت ہے مگر جس راکٹ پر ہم نے سفر کیا اس نے ہم کو بخیریت تمام تیسرے دن مریخ پہونچا دیا۔ اور ہمارا راکٹ ایک بڑے سمندر میں جا کر رکا۔ میں نے اس موجیں مارتے ہوئے سمندر کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ اب ہم یہاں سے جہاز وغیرہ پر خشکی تک جائیں گے۔ مگر میرے اس خیال کے برخلاف میرا چھوٹا بچہ فوراً راکٹ سے اترا اور پانی کی ان خوفناک موجوں پر نہایت اطمینان کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ دراصل مجھ کو اس منظر پر انتہائی تعجب ہوا اس لئے کہ اس قسم کے معجزوں کا ذکر انجیل مقدس میں تو ضرور پڑھا تھا۔ مگر ایسا کوئی واقعہ اپنی نگاہوں سے اب تک نہ دیکھا تھا۔ غالباً میرا بڑا بچہ میرے اس تعجب کو فوراً سمجھ گیا۔ اور اس نے مسکرا کر کہا۔

"یہاں کا یہ سمندر ہی دراصل براعظم ہے اور یہاں اسی پانی کی سطح پر لوگ اس طرح چلتے پھرتے دوڑتے اور اُچھلتے ہیں جیسے آپ کی دنیا میں خشکی پر۔ البتہ یہاں کی خشکی میں انسان ڈوب جاتا ہے۔ گویا خشکی اور تری میں مریخ کی دنیا ہماری دنیا کی ضد ہے۔ وہاں کی خشکی یہاں کی تری ہے اور وہاں کی تری یہاں کی خشکی اور یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ دنیا اُلٹی ہے یا وہ۔"

میری حیرت بدستور قائم تھی۔ مگر بیگم حیرت سے زیادہ خوف زدہ تھیں۔ اور کسی طرح ان موجوں پر چہل قدمی کے لئے تیار نہ تھیں۔ مگر جب میرے دونوں بچے اور ترنگول سب ان ہی موجوں پر اطمینان سے ٹہلنے لگے اور اس کے بعد خود میں بھی سطح آب پر ان کو دکھانے کے لئے نمونتاً ایک آدھ قدم چلا تو وہ بھی زیر لب کچھ پڑھتی ہوئی راکٹ سے نکل آئیں۔ اور ہم سب ایک ہوائی جہاز پر بیٹھ کر آبادی کی طرف اڑ گئے۔ میں نے طے کیا کہ یہاں کسی اچھے ہوٹل میں قیام کروں گا۔ مگر عزیزی میاں ترنگول سلمہٗ نہ مانے اور جب میں نے دیکھا کہ ان کی ناراضگی بڑھ رہی ہے تو مجبوراً ہم سب کو ان ہی کے یہاں قیام کرنا پڑا۔ وہ خود یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہتے تھے مگر ان کے والد محترم مکرمی ززنگول صاحب ملک ششاشہ کے دارالسلطنت دغدغہ میں راکٹ بنانے کے ایک بڑے کارخانے کے مالک تھے اور ان کی کوٹھی ایک ریگستان کے ساحل پر بنی ہوئی تھی۔ ریگستان کا ساحل میں نے اس لئے کہا کہ وہاں ریگستان کو ہی سمندر کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور ریگستانوں ہی میں جہاز رانی ہوتی ہے ززنگول صاحب کی کوٹھی غالباً نہایت نازک نازک لہروں کی بنی ہوئی تھی۔ جس میں جا بجا بہت سے حباب اور گرداب نہایت نفاست کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ اور موٹی موٹی لہروں کے ستونوں پر یہ عظیم الشان عمارت قائم تھی۔

ززنگول صاحب ہم سب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ نہایت اخلاق بھرے انداز میں دُم ہلا کر سلام کیا اور میری ناک سے اپنی ناک رگڑ دی۔

یہ در اصل مریخ کا مصافحہ ہوتا ہے مسز ترنگول نے بیگم کو اسی طرح تعظیم دی۔ اور ہم کو ایک بڑے کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ لہذا میرے بچے بھی میرے ساتھ ہی رہے اور اس لحاظ سے اچھا بھی ہوا کہ مجھ کو اس نئی دنیا میں قدم قدم پر رہنماؤں کی ضرورت تھی۔ اور ترنگول صاحب سے ایک ایک بات پوچھنا کچھ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ لہذا اس سلسلہ میں ترنگول سلمۂ بیچارہ گویا سایہ کی طرح میرے ساتھ تھا۔ مثلاً سب سے پہلے تو مجھ کو غسل کرنے کی دقت پیش آئی اس لئے کہ یہاں گویا پانی کے بجائے مٹی سے غسل کرنا چاہیئے تھا۔ مگر ترنگول سلمۂ نے مجھ کو اس تیمم سے بچا لیا اور یہ بتایا کہ یہاں اس قسم کے تمام کام گیس سے لئے جاتے ہیں۔ لہذا میں نے اطمینان کے ساتھ غسل کی تیاری شروع کردی مگر غسل سے پہلے شیو بنانا بھی ضروری تھا اور یہاں میرا وہ بجلی کا برش موجود نہ تھا جس سے میں ڈاڑھی بنایا کرتا تھا لہذا ترنگول نے اپنے والد محترم کی ڈاڑھی بنانے والی ٹارچ لاکر مجھ کو دی۔ اور بتایا کہ اس کی روشنی جہاں جہاں پڑے گی ایک ہفتہ کے لئے جلد بالوں سے صاف ہو جائے گی۔ یہ طریقہ مجھ کو اپنے بجلی کے برش سے زیادہ پسند آیا۔ مگر چونکہ اس سے شیو بنانے کا پہلا اتفاق تھا لہذا مصیبت یہ ہوئی کہ تھوڑی سی روشنی میری مونچھوں پر بھی پڑ گئی اور ایک طرف مونچھوں کا ایک حصہ غائب ہو گیا۔ میں مونچھیں بنانے کا دراصل قائل نہیں ہوں مگر کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ لہذا بغیر مونچھوں کے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہوں۔ بہرحال اب جو آئینہ دیکھتا ہوں تو ایک طرف کی مونچھیں

تو بالکل ٹھیک تھیں اور دوسری طرف کچھ دیمک لگی ہوئی سی معلوم ہوئی تھیں۔ بلکہ یوں سمجھ لیں کہ ناک کے نیچے ۲۲ کا نقشہ نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی اپنی اس حالت پہ غور ہی کر رہا تھا کہ میرے دونوں بچے آموجود ہوئے اور میری صورت دیکھ کر لگے قہقہے اڑانے۔ باپ پر ہنسنا یقیناً بدتمیزی ہے۔ مگر میرے خیال میں ۲۲ کا موچھ والے باپ پر نہ ہنسنا بھی سعادتمند اولاد کے لئے ایک قسم کا عیب ہے۔ اس سے ان کا ذہن کند ہو جاتا ہے اور برجستگی کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے ان کی ہنسی پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ البتہ ان سے رائے لی کہ بتاؤ اب کیا کیا جائے اتنی ہی دیر میں ترنگول بھی اپنی چچی یعنی میری بیگم کو لے کر آ گیا۔ بیگم نے پہلے تو مجھ کو گھور کر دیکھا اور پھر ہنس دیں۔ میں نے نہایت افسوسناک لہجہ میں اس حادثہ کی تفصیل بیان کی۔ تو ترنگول نے فوراً کہا۔

"جی ہاں، اس ٹارچ سے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ مگر ایک ترکیب ہے کہ میرے والد صاحب کے آئینہ میں آپ اپنا منہ دیکھئے۔ بال پھر سے نکل آئیں گے اور اس کے بعد آپ از سر نو اپنی ڈاڑھی بنا لیجئے گا۔"

مجھ کو اس پر سخت حیرت ہوئی۔ مگر ترنگول دوڑ کر گیا اور آئینہ اٹھا لایا۔ مگر قبل اس کے کہ میں آئینہ دیکھوں بیگم نے آئینہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا وہ تو کہئے ترنگول ماشاءاللہ بڑا سمجھدار بچہ ہے۔ اس نے فوراً آئینہ ہٹا کر نہایت خوفزدہ انداز سے کہا۔

"کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا ایک مرتبہ خود میری والدہ نے

غلطی سے یہ آئینہ دیکھ لیا تھا اور ان کے چہرے پر ڈاڑھی نکل آئی تھی جو بڑی مشکل سے ایک ہفتہ کے علاج کے بعد دور ہو سکی۔"

بیگم یہ سنتے ہی منھ پھیر کر کھڑی ہو گئیں کہ کہیں آئینہ کا کوئی رُخ ان کی طرف نہ ہو جائے۔ اور میں نے آئینہ لے کر جو دیکھا تو آپ سے کیا عرض کروں کہ کس قدر نورانی قسم کی گھنی ڈاڑھی یکایک پیدا ہو گئی۔ ایسی ڈاڑھی کہ خود مجھ کو اپنی شکل پر والد صاحب مرحوم و مغفور کا شبہ ہونے لگا۔ میں نے آئینہ فوراً رکھ دیا اور بیگم سے کہا۔

"اب بتاؤ کہ اس نورانی ڈاڑھی کو رہنے دوں یا صاف کر دوں"

بیگم تو خوفزدہ ہو کر میرے سوال کا جواب نہ دے سکیں مگر میرے بڑے بچے نے کہا۔

"ذرا ٹھہریئے اس ڈاڑھی پر ایک تصویر لے لوں پھر آپ کو اختیار ہے" اور میرا چھوٹا بچہ پنسل لے کر غالباً میرا کارٹون بنانے لگا۔

بہرحال تصویر کشی کے بعد میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ شیو بنایا اور شکر ہے کہ ابکی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ لہذا میں فوراً غسل کے لئے چلا گیا اور ایک منٹ کے اندر ہی غسل سے فارغ ہو کر میں باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیونکہ مریخ کی سیر کے لئے میں بیقرار تھا۔ مگر اس سے قبل کہ میں باہر جا سکوں تو رنگول صاحب نے کہلا بھیجا کہ اس وقت شکار کا پروگرام ہے۔ اگر میں ان کے ہمراہ چلنا چاہوں تو چلوں۔

میں تو تیار تھا ہی فوراً ان کے ہمراہ شکار پر روانہ ہو گیا۔ اور ایک ہوائی جہاز

پر بیٹھ کر ہم سب چند منٹ میں ایک گھنے جنگل میں پہونچ گئے۔ جہاں ایسے ایسے جانور تھے جو میں نے آج تک نہ دیکھے تھے۔ مثلاً سونڈ والے ہرن، اڑنے والے شیر، ہاتھی کے برابر خرگوش اور بہت سے ایسے چوپائے جو دنیا کے کسی جانور سے مشابہ نہیں ہوتے۔ ژرنگول صاحب نے بتایا کہ یہاں کا بہترین شکار مینڈک کا ہوتا ہے اور مینڈک ہی یہاں کا سب سے زیادہ خوفناک چوپایہ سمجھا جاتا ہے۔ میں یہ سن کر ہنسنے ہی والا تھا کہ ژرنگول صاحب نے ایک طرف اشارہ کر کے بتایا کہ مینڈک وہ آرہا ہے۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو واقعی وہ نہایت خوفناک مینڈک تھا۔ شکل وصورت تو بالکل مینڈک کی ایسی تھی مگر قد و قامت میں وہ گینڈے سے کم نہ تھا۔ ژرنگول صاحب نے پہلے تو ایک پستول نکال کر نشانہ باندھا اور پھر پستول کی لبلبی جو دبائی تو بجائے آواز پیدا ہونے یا کارتوس نکلنے کے اس میں سے ایک خاموش قسم کی روشنی کی لہر نکلی اور وہ چوکڑیاں بھرتا ہوا خوفناک مینڈک گویا اپنی جگہ پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کسی نے باندھ دیا ہو۔ اس کے بعد ژرنگول صاحب نے بندوق کی نالی میں گھی، نمک، مرچ اور مسالہ وغیرہ بھر کر جو فائر کیا تو وہ مینڈک وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ آخر اس میں گھی، مرچ وغیرہ کیوں بھرا تھا تو ژرنگول صاحب نے بتایا کہ یہاں شکار اسی طرح ہوتا ہے اب اس جانور کو پکانے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ آپ کو اس کا گوشت نہایت عمدہ بھنا بھنایا اور چٹپٹا، مسالہ دار ملے گا۔ میں حیرت سے منھ کھول کر رہ گیا۔ اور ژرنگول صاحب نے اپنا شکار اٹھا کر ہوائی جہاز پر لادا۔ اب ہم واپسی کی

تیاریاں کر رہے تھے کہ میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایسا منظر جو اس دنیا والے خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یعنی ایک اونٹ اڑتا ہوا بالکل ہمارے سر پر سے گذر گیا۔ میں نے حیرت سے کہا یہ کیا ہے۔ تو ژرنگول صاحب نے نہایت لاپروائی سے کہا۔ کہ یہ اونٹ ہے۔ نہایت قیمتی پرندہ ہوتا ہے اور اہل مریخ عام طور پر اسی کے دودھ کی چائے وغیرہ پیتے ہیں۔ وہ اونٹ کی تعریف کرتے رہے اور میں حد نظر تک اس کی اڑان کا تماشہ دیکھتا رہا۔۔ آخر ژرنگول صاحب نے کہا کہ۔ اب چلئے بچے انتظار کرتے ہوں گے۔ اور کھانے کا وقت بھی قریب ہے۔ میں نے کہا کہ کم سے کم شام تک اس جنگل میں ٹھہریئے۔ یہاں تو عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ مگر شام کا نام سن کر وہ ہنسنے لگے۔ اور دیر تک ہنسنے کے بعد بولے کہ غالباً آپ اپنی دنیا کی طرح شام کو بہت قریب سمجھ رہے ہونگے۔ حالانکہ یہاں بارہ بارہ گھنٹے کے دن اور رات نہیں ہوتے بلکہ ایک ہفتہ کے برابر دن اور ایک ہفتہ کے برابر رات ہوتی ہے۔ میں یہ سُن کر حیران رہ گیا اس لئے کہ میرے نزدیک ایک ہفتہ تک مسلسل جاگنا کوئی آسان کام نہ تھا اور اس سے زیادہ مشکل ایک ہفتہ تک مسلسل سونا تھا۔ مگر اب تو اسی دنیا میں چند دن رہنا تھا۔ اور اسی کے صبح و شام کی پابندی کرنا تھی۔

لہذا نہایت خاموشی کے ساتھ ژرنگول صاحب کے ہمراہ واپس گیا۔ واپسی پر میں نے دیکھا کہ مسز ژرنگول اور بیگم چھوٹی چھوٹی چھتریاں لگائے فضاء میں پرواز کر رہی ہیں۔ اور میرے بچے ژرنگول کے ساتھ اپنی کوٹھی کے سامنے والے میدان میں پیراکی کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ دراصل میرے لئے

یہ تمام مناظر کچھ ایسے عجیب و غریب تھے کہ میں کبھی کبھی یہ محسوس کرتا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ مناظر دیکھنے کے فوری بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر پہونچ گئے۔ مگر اب یہاں مصیبت یہ تھی کہ پہلے کھانا کھانا سیکھیں اس کے بعد اس کی مشق کریں۔ پھر کہیں کھانے کی نوبت آئے۔ اس لئے کہ کھانے کی میز کے بیچ میں تو تمام لذیذ کھانے چنے ہوئے تھے۔ اور ہر کرسی کے سامنے چھوٹے چھوٹے ٹائپ رائٹر رکھے ہوئے تھے۔ میں حیران تھا کہ کھانے کی میز پر ٹائپ رائٹر کا کیا تک ہے۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ یہاں ان ٹائپ رائٹروں ہی سے کھانا کھایا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے ایسی ہی مشق کی ضرورت ہوتی ہے جیسی کسی زمانہ میں ٹائپ کرنے والوں کے لئے مشق کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ژرنگول صاحب نے بیٹھتے ہی اس مشین پر انگلیاں چلانا شروع کر دیں اور اسی رفتار سے جلد جلد مختلف چمچے مختلف پلیٹوں سے اٹھ اٹھ کر ان کے منھ میں جانے لگے۔ میں پہلے تو حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ان کی نقل جو میں نے کی اور ایک بار مشین پر انگلیاں چلائیں تو تین خالی چمچے میرے منھ میں گھس گئے۔

اس پر سب کو ہنسی آگئی۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ میں نے اتفاق سے ان بٹنوں پر انگلیاں رکھ دی تھیں جو پڈنگ اور سلاد وغیرہ کے لئے تھے اور یہ چیزیں اس وقت کے کھانے پر نہ تھیں۔ بہر صورت امید ہے کہ چند دن میں مجھ کو ٹائپ شدہ کھانا آجائے گا۔

مریخ کی سیر

آج ۲۰۵۸ء کے ماہ جنوری کی پانچویں تاریخ ہے۔ گویا اس حیثیت سے دنیا کے حساب کے مطابق مجھ کو دنیا چھوڑے ہوئے آج پندرھواں دن ہے۔ لیکن اس مریخ کی دنیا میں ایک ہفتہ کا دن اور ایک ہفتہ کی رات ہوتی ہے۔ اور اس اعتبار سے گویا ابھی دوسرا ہی دن ہے۔ مگر آپ کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ میں نے اس تھوڑے عرصہ میں اس دنیا کی خوب سیر کرلی ہے۔ اور اپنے نزدیک جو کچھ دیکھا ہے وہ کیا وہ ہزار آنکھیں بھی پاتے تو مریخ کی دنیا کے ان مناظر کو دیکھ کر ؎

حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

کے بجائے یہی کہتے کہ ؎

دو ہزار آنکھیں بھی حیراں ہیں کہ کیا کیا دیکھیں

یہ دنیا ہماری دنیا سے بہت زیادہ بڑی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے مریخ کا کونہ کونہ چھان مارا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اس دنیا کے چپہ چپہ پر اپنا پسینہ ٹپکایا ہے۔ ہر براعظم کا ہر ملک اور ہر ملک کا ہر شہر دیکھا۔ مشہور تاریخی مقامات کی سیر کی اور اس عجیب و غریب دنیا کے وہ حالات دیکھے جو میرے خواب و خیال کے لئے بھی ناممکن تھے میں چاہتا ہوں کہ ان تمام حالات کو ترتیب کے ساتھ پیش کروں تاکہ مریخ کی دنیا کا کوئی واقعہ رہ نہ جائے۔ دراصل اس دنیا کا تمام تر دارومدار سائنس کی حیرت انگیز ترقی پر ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ہماری دنیا کے ماہرین سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہوتی تو آج ان میں کا ہر سائنس داں

اپنی اپنی جگہ خدا بن کر بیٹھ جاتا مگر مریخ کے یہ باکمال سائنس داں اپنی ان ترقیوں کے باوجود یہی سمجھتے ہیں کہ ابھی تک ابتدائی منزلیں طے نہیں ہوئی ہیں۔ ورنہ سائنس تو وہ علم ہے جو انسان کو اپنی ہر مجبوری پر فاتحانہ ہنسی ہنسنے کے قابل بنا سکتا ہے۔ مثلاً ہماری دنیا کے سائنس داں ابھی تک موت پر قابو حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مگر مریخ کے سائنس داں یہ منزلیں طے کرنے کے بعد اس فکر میں ہیں کہ انسان اپنی مرضی کے مطابق مختلف جسم کیونکر لے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں میرے میزبان محترمی ماتر نگول کے گھر ہی میں ایک عجیب وغریب مثال موجود ہے۔ یعنی آپ کے برادر عزیز زرنگول صاحب کو بلیوں سے بڑی دلچسپی تھی اور آپ اس جانور کی صفائی اور مسکینیت کے ایسے دلدادہ تھے کہ آخر کار آپ نے یہی کوشش کی کہ خود آپ کو بلی بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہاں کے ایک مشہور سائنس داں نے آپ پر اپنا عمل شروع کیا اور اس یقین کے ساتھ کہ اگر عمل ناکام بھی ہوا تو پھر آپ کو انسان بنا دیا جائے گا اور پھر آپ کو بلی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر خدا جانے کیا غلطی ہوئی کہ آپ بجائے بلی بننے کے کتا بن کر رہ گئے۔ پھر ایک مصیبت یہ ہوئی کہ کتے بھی نہایت مستقل قسم کے بنے۔ یعنی اس وقت سے اب تک برابر یہی کوشش کی جا رہی ہے کہ آپ کو یا تو انسان بنا دیا جائے یا آپ کی مرضی کے مطابق بلی کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ مگر اب تک ہر کوشش ناکام ہے۔ میں نے تو جب اس کتّے کو دیکھا تو یہی سمجھا کہ یہ پالتو کتا ہے۔ مگر ایک روز ترنگول سلمہٗ نے اس کو نہایت ادب کے ساتھ چچا جان کہا تو مجھ کو بڑی ہنسی آئی کہ یہ لڑکا بھی

عجیب معجزہ ہے جو کتے کو چچا کہتا ہے۔ مگر میری اس ہنسی پر تزرنگول صاحب نے ایک آہِ سرد بھر کر یہ قصہ سنایا۔ اور اس وقت سے میں اس کتے کی زندگی کا عجیب و غریب تماشہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ صورتاً تو کتا ہے۔ وہی منہ اور وہی اگلی پچھلی ٹانگیں۔ بلکہ بالکل وہی دم مگر اس شکل وصورت کے بعد اس میں اب تک بہت سے انسانی حرکتیں بھی ہیں۔ مثلاً وہ بول تو سکتا نہیں مگر سنتا اور سمجھتا سب کچھ ہے بلکہ یہ کتا روزانہ صبح کے وقت چشمہ لگا کر تازہ ترین اخبار پڑھتا ہے۔ سگریٹ پیتا ہے اور کھانے میں بھی انسانوں کی طرح نفاست سے کام لیتا ہے۔ گھر کے نوکر چاکر سب اس کو تزرنگول کا بھائی سمجھ کر چھوٹے سرکار کہتے ہیں اور تزرنگول تو واقعی نہایت سعادت مند بچہ ہے جو ایک کتے کو بھی چچا جان کہتے ہوئے نہیں شرماتا۔ حالانکہ آج کل کے لڑکے اپنے باپ تک کو جو کتا نہیں انسان ہوتا ہے باپ کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ بہرحال اس کتے کی زندگی بھی نہایت عبرت انگیز ہے مگر تزرنگول صاحب کو اطمینان ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور انسان بن جائے گا۔ اور یہ جو کچھ ہے در اصل اس کو انسانی زندگی پر بلی کی زندگی کو ترجیح دینے کی سزا مل رہی ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو مگر ذرا غور کیجئے کہ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ یہاں کے سائنس داں ایک انسان کے دُم تک لگا سکتے ہیں۔ خواہ وہ کتے کی ہو یا بلی کی میں نے ایک روز تزرنگول سلمہٗ سے کہا کہ تم اپنے چچا کی طرح اپنی انسانی شکل تبدیل نہ کرنا تو اس نے ہنس کر کہا کہ میرے چچا نے میرے علاوہ بہت سے مریخی نوجوانوں کو جو اس قسم کا ارادہ کر سکتے تھے ایک عبرت کا سبق مہیا کیا ہے اور مجھ کو اگر اپنی شکل ہی تبدیل کرنا ہوگی

تو میں آپ کی دنیا کا انسان بنوں گا۔ مجھ کو یہ مچھلی کا جسم اچھا نہیں لگتا۔ میں نے یہ سن کر ترنگول کے گالوں پر محبت سے ایک طمانچہ مارا۔ اور وہ ہنسنے لگا۔

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مریخی سائنس دانوں کے یہ تجربے ابھی ناکام ہیں مگر ایک نہ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس وایجادات کے سلسلے میں مریخ کی دنیا ہماری دنیا سے بہت آگے ہے اور ہر شعبہ میں مریخ والے جہاں تک پہونچ چکے ہیں وہاں ہماری دنیا صدیوں میں پہونچے گی۔ صرف ایک ریڈیو ہی کو لے لیجئے۔ ہماری دنیا کو اس پر ناز ہے کہ اگلے زمانے میں بغیر کسی سلسلے کے محض ہوا کے زور پر ایک جگہ کی آواز دوسری جگہ پہونچا دینے کو کمال سمجھا جاتا تھا مگر اب جس شخص کی آواز ہو اس کی تصویر بھی پہونچ جاتی ہے لیکن مریخ والے ریڈیو کی اس ترقی پر ہنستے ہیں اور واقعی ان کو ہنسنا بھی چاہیئے اس لئے کہ یہاں تو ریڈیو ایک ایسے جیتے جاگتے جادو کا نام ہے جو سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ یہاں محض آواز سننے والے آلے جو ہیں وہ تو اتنے چھوٹے ہیں کہ عورتیں اپنے کانوں کی کیلوں میں نگینہ کی طرح جڑوا لیتی ہیں اور مرد اپنی ٹائی کی پن میں یہ آلہ لگوا لیتے ہیں اور آواز آتی رہتی ہے لیکن در اصل حیرت انگیز آلے وہ ہیں جو ایک میز کی شکل میں ہر گھر میں پائے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ محض میز ہوتی ہے لیکن جس وقت اس کا بٹن دبایئے فوراً بے شمار شعاعیں اس میز کے اوپر پیدا ہو کر اسی شخص کو میز پر کھڑا کر دیتی ہیں جو تقریر کرتا یا گاتا ہے۔ یہ شخص ہو بہو نظر کے سامنے ہوتا ہے۔ وہی قد و قامت وہی رنگ

اور وہی ہر بات جو نقل کو مطابق اصل بنا دے ۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اگر آپ اس مجسمہ کو چھونا چاہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جس چیز کو آپ چھو رہے ہیں وہ صرف عکس ہے میں نے ژرنگول صاحب کے ریڈیو پر اکثر تقریریں سنیں۔ مگر ایک دن ایک تقریر اس قسم کی سنی کہ ایک صاحب ہوائی جہاز پر کہیں سفر کر رہے تھے اور اسی سلسلے میں تقریر بھی فرما رہے تھے چنانچہ وہ مع اپنے ہوائی جہاز کے نظر آئے ۔ مجھ کو چونکہ ریڈیو کے معاملات سے دلچسپی ہے لہٰذا میں نے ژرنگول صاحب سے پوچھا کہ آخر یہ تقریر کیونکر اور کیسے براڈ کاسٹ ہوئی ہے اس لئے کہ یہ حضرت تو سفر میں ہیں اور ہوائی جہاز میں براڈ کاسٹنگ اسٹیشن بھی نہیں۔ ژرنگول صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ یہ کون سی بات ہے ۔ دراصل یہاں جتنے ریڈیو اسٹار ہیں ۔ ان کو کبھی لازمی طور پر براڈ کاسٹنگ اسٹیشن نہیں جانا پڑتا ۔ بلکہ براڈ کاسٹنگ کے محکمہ کی طرف سے ان کو ایک جیبی اسٹیڈیو اس قسم کا دے دیا گیا ہے جس میں عکس ریز آئینہ بھی ہے اور آلہ نشر صوت بھی چنانچہ وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں وقت مقررہ پر پروگرام کے مطابق براڈ کاسٹنگ شروع کر دیتے ہیں ۔ مجھ کو اس انتظام پر رشک سا ہوا اس لئے کہ ہماری دنیا میں اس قسم کا جیبی اسٹیڈیو دینا تو کیا معنی ریڈیو اسٹار کو براڈ کاسٹنگ کی طرف سے ریڈیو تک نہیں دیا جاتا ۔ اور وہ خود اپنے سو کام چھوڑ کر براڈ کاسٹ کرنے کے لئے مقررہ وقت پر ریڈیو اسٹیشن جاتا ہے ۔ ژرنگول صاحب نے بتایا کہ ریڈیو اسٹیشن تو خیر یہاں بھی نہایت باقاعدہ بنے ہوئے ہیں اور بہت سے مقرر ریڈیو اسٹیشن سے

ہی تقریر کرنا پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً گانے کا پروگرام عام طور پر ریڈیو اسٹیشن ہی میں ہوتا ہے۔ تاکہ گانے والا اور ساز والے سب ایک جگہ پر ہوں لیکن اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ گانے والا ہوائی جہاز پر سفر میں ہے۔ طبلہ بجانے والا اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ پیانو ماسٹر کسی اور جگہ ہے اور دوسرے سازندے کہیں اور۔ لیکن پروگرام میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے سیکڑوں میل دور رہ کر پروگرام کی تکمیل کرتے ہیں اور باوجود اس دوری کے گانے اور ساز کی سنگت میں ذرا بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس قسم کے موقعوں پر جو عکس آتے ہیں۔ وہ قابل دید ہوتے ہیں کہ گانے والا ہوائی جہاز میں نظر آ رہا ہے۔ طبلہ والا اپنے کھیت میں بیٹھا طبلہ بجا رہا ہے۔ پیانو ماسٹر اپنی سسرال میں پیانو بجا رہا ہے اور کوئی سازندہ ہوائی سائیکل پر لے نوازی کر رہا ہے تو کوئی ساحل سمندر پر بیٹھا جل ترنگ بجا رہا ہے۔ مگر جب یہ سب آوازیں یکجا ہوتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک ہی کمرے میں بیٹھے ہیں۔ میں نے ٹرنگول صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھ کو یہاں کا کوئی ریڈیو اسٹیشن دکھا دیجئے۔ تو انھوں نے فرمایا دکھانا کیا معنی ریڈیو والے تو آپ کی تقریر براڈ کاسٹ کرنے کے لئے بیقرار ہیں اس لئے کہ آپ اس دنیا کے انسان ہیں لیکن مریخستانی زبان بھی جانتے ہیں اور ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ اس دنیا کے ریڈیو اسٹار بھی ہیں۔ بہر حال اب میں ان کو اطلاع دیئے دیتا ہوں کہ آپ اپنی تقریر براڈ کاسٹ کرنے کو تیار ہیں۔ میں اس شوق میں بغیر معاوضہ معلوم کئے خاموش

ہو گیا کہ مجھ کو ایک جیبی اسٹیڈیو سے لگا اور میں اس کو اپنی دنیا میں لے جا کر ریڈیو اسٹیشن کی حاضری سے بچ جاؤں گا۔ چنانچہ میری تقریر کا نہایت شاندار طریقہ پر اعلان ہو گیا۔ اور جیبی اسٹیڈیو پر قبضہ کرنے کے بعد بھی مناسب یہی سمجھا کہ میں ریڈیو اسٹیشن ہی سے تقریر کروں اور وقت مقررہ پر اسٹیشن پہونچ گیا۔ ریڈیو اسٹیشن دغدغہ کا مرکزی اسٹیشن تھا۔ اس میں مختلف اسٹیڈیو تھے۔ جس اسٹیڈیو میں میں پہونچایا گیا وہ دراصل جانوروں کے لئے مخصوص ہے اور چونکہ مجھ کو بھی یہاں کی دنیا میں زندہ عجائب خانہ کی ایک عجیب الخلقت جانور کی حیثیت حاصل تھی۔ لہذا میرا شمار بھی غالباً جانوروں میں کیا گیا۔ بہرحال میرے وہاں پہونچتے ہی اعلان کرنے والے صاحب بھی تشریف لے آئے اور پہلے تو دیر تک چاروں طرف گھوم گھوم کر مجھ کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد مجھ کو سونگھا۔ پھر ان کو آداب مجلس کا خیال آیا اور ناک سے ناک رگڑ کر مصافحہ کرتے ہوئے بولے کہ اب میں تقریر کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں اور شیشے کی اس قد آدم اچار دانی میں جا کر بیٹھ جاؤں جو کمرہ میں ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ میں ان کے حکم کی تعمیل میں اپنے کو گاجر یا سیب کا مربہ یا آم کا اچار سمجھ کر اس اچار دانی میں جا کر کھڑا ہو گیا اور فوراً ہی وہ اچار دانی مختلف قسم کی روشنیوں سے جگمگا اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کرنے والے صاحب نے اعلان کیا۔

"یہ دغدغہ ہے اور ہم منہ سے بول رہے ہیں۔ آج دنیا کے ایک صاحب جو مریخ کی سیر کے لئے آئے ہوئے ہیں آپ کے پیش نظر ہیں ان صاحب کا ہاضمہ

درست ہے اور ان کو کوئی مرض ایسا نہیں جس کے جراثیم آپ کو نقصان پہونچائیں۔ لہذا آپ ان کی تقریر نہایت شوق سے سن سکتے ہیں اور آپ کو ان کے عکس سے دور ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ یہ صاحب اپنی تقریر کے دوران میں چھینکنے اور ڈکار لینے سے پرہیز کریں گے اور اس کی احتیاط رکھیں گے کہ یہاں تھوکنا سخت منع ہے کیونکہ اس سے بیماری پھیلتی ہے۔"

یہ اعلان میرے لئے عجیب وغریب تھا مگر میں نے اپنے چہرے سے حیرت کے آثار پیدا نہ ہونے دیئے اس لئے کہ میری وحشت سننے اور دیکھنے والوں تک پہونچ جانے کے خطرے میں مبتلا تھی۔ بہرحال میں نے اعلان کے بعد نہایت فصاحت کے ساتھ مریخستانی زبان میں اپنی دنیا کے حالات بیان کئے اور دیر تک تقریر کرتا رہا۔ آخر اس اچار دانی کی روشنی گل ہوگئی اور میں باہر آیا۔ تو اعلان کرنے والے صاحب نے مجھ کو میری تقریر کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ اور ایک لفافے میں ایک ایسا چیک دیا جس کی رقم کے اعداد کا مجھ کو اس وقت علم ہوا جب گھر آکر ترنگول صاحب سے اس کے متعلق گفتگو ہوئی۔ وہ رقم کیا تھی اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اگر دنیا میں زندگی بھر ریڈیو پر تقریریں کرتے رہیں تو بھی بحیثیت مجموعی اتنی رقم نہیں مل سکتی جتنی اس ایک تقریر کے معاوضہ میں ملی تھی۔

مریخی جنتری کی تاریخیں اور ہفتے کم سے کم میری سمجھ میں تو آتے نہیں۔ لیکن میرے حساب سے اگر میری گھڑی ٹھیک ہے اور اس کی تاریخ والی سوئی غلط نہیں

چل رہی ہے تو آج ۹ اپریل [illegible]ء ہے۔ معلوم نہیں اس وقت میری دنیا میں دن ہوگا یا رات۔ مگر یہاں تو خدا خدا کر کے اب دن ختم ہوا ہے اور رات شروع ہوئی ہے۔ مگر صاحب یہ رات بھی عجیب و غریب رات ہے کہ جب چاہے دن بنا لیجئے ورنہ رات تو ہے ہی دن کو رات بنانا تو خیر آسان کام ہے کہ کسی تاریک کمرے میں بیٹھ جائیے ایک کتا بھونکنے پر تعینات کر دیجئے۔ لیجئے رات ہو گئی مگر رات کا دن بنانا کھیل نہیں ہے اور نہ اس کی ترکیب میرے دنیاوی ذہن میں آ سکتی تھی مگر یہاں جیسے ہی رات شروع ہوئی میرے میزبان ژرنگول صاحب نے مجھ کو فوراً ایک چشمہ دے دیا۔ اس کو اپنے پاس رکھئے جس وقت اس کو آپ آنکھوں پر لگائیں گے رات کی یہ تمام تاریکی دور ہو جائے گی اور یہی سیاہ رات روز روشن نظر آنے لگے گی میں پہلے تو سمجھا کہ ژرنگول صاحب کی طبیعت اس وقت موزوں ہے اور آپ مذاق فرما رہے ہیں مگر جب میں نے چشمہ لگایا تو معلوم ہوا کہ اس وقت رات کا خیال بھی ذہن میں نہیں آ سکتا میں نے تعجب کے ساتھ دو تین مرتبہ جلدی جلدی چشمہ کو لگایا اور اتارا اور اس کے بعد اس چشمہ کی کرامت کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ میں نے ژرنگول صاحب سے کہا کہ اس چشمہ کا ایک نہایت دھندلا سا خاکہ ہماری دنیا کے لوگوں نے بھی بنایا ہے مگر وہاں یہ چشمہ اسی قدر کام دے سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے کہ رات کو کتب بینی کرے یا اخبار پڑھے تو اس کو روشنی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس قسم کا چشمہ لگا کر پڑھنے والا بخوبی پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر لکھنا چاہے تو لکھ بھی سکتا ہے۔ ژرنگول صاحب نے اپنے چشمہ کے مقابلہ میں اس چشمہ کا ذکر سنکر حیرت سے کہا یہ تو بڑی طوالت ہے کہ اخبار پڑھنے کے لئے چشمہ لگائیے اور پھر پڑھئے ہمارے یہاں تو یہ قاعدہ ہے کہ مریخ بھر میں جتنے رات کے اخبارات شائع ہوتے ہیں وہ سب ریڈیم کی روشنائی سے چھاپے جاتے ہیں اور اندھیرے میں ان کو بخوبی پڑھا

جا سکتا ہے نہ چشمہ کی ضرورت نہ روشنی کی ۔ میں نے تعجب سے کہا کہ ریڈیم
کی روشنائی بھی ہوتی ہے تو ژرنگول صاحب نے فوراً ایک کتاب الماری
سے نکال دکھائی ۔ واقعی اس کتاب کو پڑھنے کے لئے روشنی کی ضرورت نہیں
ہو سکتی ۔ تمام حروف خود ہی جگمگاتے ہیں اور جس قدر اندھیرا ہو اسی قدر ان
حروف کی روشنی زیادہ ہو جاتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے گویا کاتب نے جگنو کی دم سے
اس کتاب کی کتابت کی ہے ۔ یا روشنائی میں ستارے پیس کر گھول دیئے ہیں ۔
میں اس کتاب کو حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ ژرنگول صاحب نے فرمایا کہ
اس میں شک نہیں کہ ریڈیم کی چھپائی کا یہ طریقہ نہایت اچھا ہے مگر اب تو
یہ بھی ختم ہوتا جاتا ہے بلکہ بڑے بڑے اخبارات اور کتابوں کے پبلشر اب اس کو
بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ پڑھنے کے لئے آنکھوں پر زور دیا جائے اس لئے
اب تو آنکھیں بند کر کے کتاب اور اخبار پڑھنے کا طریقہ بہت مقبول ہو رہا ہے ۔
یقین جانئے کہ حیرت کے مارے ہاتھ سے کتاب گرتے گرتے بچی مگر میں نے فوراً
ژرنگول صاحب کا منہ دیکھا کہ یہ حضرت کہیں اب مذاق کی طرف تو رجوع نہیں
ہوئے ہیں ۔ مگر وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے ۔ البتہ اگر حیرت نے
مجھ کو مضحکہ خیز بنا دیا ہو تو دوسری بات ہے میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد
ژرنگول صاحب سے کہا کہ آنکھ بند کر کے پڑھنا میری سمجھ میں نہیں آیا ۔ یہ تو بالکل ایسی
ہی بات ہے جیسے بغیر ناک کے سونگھا اور بغیر کان کے سنا جائے ۔ ژرنگول صاحب نے
بدستور سنجیدگی کے ساتھ کہا ۔ جی ہاں آنکھ بند کر کے پڑھنے سے میری مراد یہ ہے کہ اب
تو اس قسم کے اخبارات جاری ہو رہے ہیں ۔ جن کو آپ گراموفون کی مشین پر
رکھ دیں اور وہ خود ہی بولنے لگیں ۔ وہ خود ہی خبریں سنانے لگیں ۔ خود ہی
مضامین پڑھتے ہیں اور خود ہی تمام عبارت جو اس اخبار میں ہوتی ہے آپ کو

سنا سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ تو پھر یہ کہئے کہ گراموفون کی پلیٹوں پر اخبارات چھپتے ہوں گے تو زرنگول صاحب نے میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی کہا۔ کہ جی نہیں بلکہ کاغذ پر البتہ وہ کاغذ اسی مسالے کا ہوتا ہے۔ جس کے کسی زمانے میں گراموفون ریکارڈ ہوا کرتے تھے۔ مگر اب کاغذ کو اس مسالے میں ملا کر بالکل کاغذ ہی کی طرح باریک ۔۔۔ ہلکا لچکدار اور ہر طرح مڑ جانے والا بنا دیا گیا ہے۔ یہ اخبارات بالکل کاغذ کے ہوتے ہیں۔ مگر گراموفون کی مشین یا دستی ساؤنڈ بکس سے بالکل گراموفون کی طرح بولتے ہیں میں نے کہا کہ یہ دستی ساؤنڈ بکس کیا بلا ہے تو زرنگول صاحب نے بتایا کہ ان متکلم اخبارات کے جو سالانہ خریدار ہوتے ہیں۔ ان کو اخبار والے اپنی طرف سے ایک دستی ساؤنڈ بکس دیتے ہیں۔ جو انگوٹھی کی شکل کا ہوتا ہے۔ نہایت خوبصورت اور بالکل ایک قیمتی انگوٹھی کی شکل کا جب آپ اخبارات سننا چاہیں تو اس انگوٹھی کو اخبار کے صفحہ پر چھوڑ دیجئے۔ وہ خود ہی تمام حروف پر پھرے گی اور آپ اخبار سن لیں گے۔ اس کے بعد آپ پھر انگوٹھی پہن سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر زرنگول صاحب نے مسز زرنگول کو آواز دی اور ان کے آتے ہی ان کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر مجھ کو دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ ہے وہ انگوٹھی میں خود تو کسی متکلم اخبار کا خریدار نہیں ہوں مگر یہ ایک اخبار کی سالانہ خریدار ہیں۔ لہذا ان کے پاس ہے یہ انگوٹھی۔ مسز زرنگول نے جلدی سے کہا کہ صرف انگوٹھی سے آپ کیا سمجھیں گے۔ میں اپنے اخبار کا ایک پرچہ بھی لے آؤں تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر

وہ اخبار لینے گئیں اور میں اس انگوٹھی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ واقعی یہ محض ایک انگوٹھی تھی اور بہت خوبصورت کوئی اس کو ساؤنڈ باکس کہہ ہی نہیں سکتا۔ یوں تو یہ مریخ والے اونٹ تک کو پرند کہتے ہیں اور کہتے کیا ہیں میں تو خود اُونٹ کو اُڑتے دیکھ چکا ہوں اور مینڈک کا درندہ ہونا بھی مجھ کو یاد ہے۔ بہرحال مسز ژرنگول جس وقت اخبار لے کر آئیں تو میں نے دیکھا کہ وہ معمولی کاغذ پر چھپا ہوا اخبار تھا البتہ اس کے حروف کچھ دندانے دار ضرور تھے مسز ژرنگول نے کہا اب آپ اس انگوٹھی کو اس اخبار کے کسی صفحہ پر کہیں رکھ دیجئے۔ میں نے انگوٹھی ایک جگہ رکھ دی اور وہ حروف پر اس طرح چلنے لگی جیسے کوئی پریوش ڈانس کرنے میں باریکیاں اور فنِ رقص کے کمالات دکھائے اسی کے ساتھ اس اخبار نے اس طرح بولنا شروع کیا کہ گویا کوئی اخبار کے ساتھ خود اڈیٹر صاحب چھپ کر آ گئے ہیں۔ اور اپنا اخبار خود ہی سنا رہے ہیں۔ اس وقت یہ اخبار جو خبر سنا رہا تھا وہ ایک جلسہ کا ذکر تھا۔ چنانچہ اڈیٹر نے صرف یہ لکھا تھا کہ آج ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں دغدغہ کے مشہور مقرر شاروغ نے تقریر کی اس کے بعد ہی وہ تقریر سننے میں آئی۔ جس کا لب و لہجہ اور آواز بالکل جداگانہ تھی۔ ژرنگول صاحب نے فوراً مجھ سے کہا کہ دیکھئے بولنے والے اخبارات کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ مقرر کی اصلی آواز سُن رہے ہیں۔ اس تقریر کی رکارڈنگ جلسہ گاہ میں ہوتی ہوگی اور جو خود شاروغ بول رہا ہے۔ ژرنگول صاحب یہ باتیں سمجھا رہے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ

میرا استہ دیکھ رہی تھیں جو اس وقت قابل دید ہوگا۔ مگر میں خود اس انگوٹھی
کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ کبھی تو وہ ڈُلکی چلتی تھی۔ اور کبھی اس کی رفتار میں
کہروا ناچ کی ادا آجاتی تھی۔ کبھی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پیراک پیراکی کے جوہر
دکھا رہا ہے اور کبھی وہ انگریزی مارچ شروع کر دیتی تھی۔ ہر مرتبہ وہ اس
تیزی کے ساتھ گھومتی تھی کہ گویا یہ تمام راستے اس کے جانے بوجھے ہیں۔
میں ان مناظر میں کھویا ہوا تھا کہ یکایک مسز ژرنگول نے ٹھنک ٹھنک کر
اپنے شوہر نامدار سے کہنا شروع کیا کہ ان کو شیشے والے اخبار کا خریدار
بنا دیا جائے ژرنگول صاحب نے بچوں کی طرح سمجھانا شروع کیا کہ وہ
اخبار بہت مہنگا ہے۔ اس کو غریب آدمی نہیں خرید سکتے مگر بیگم صاحبہ
بدستور مچلتی رہیں یہاں تک کہ مجھ کو بھی انگوٹھی کا رقص چھوڑ کر ان کے ناچ کی
طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور میں نے کہا کہ صاحب یہ شیشہ والا اخبار کیسا؟
ژرنگول صاحب نے بتایا کہ حال ہی میں ایک اخبار ایسا جاری ہوا ہے جو
اپنے خریداروں کو ایک ایک شیشہ کی میز دیتا ہے۔ اس میز کو آپ کمرے میں
رکھ دیجئے اور بجلی سے اس کا سلسلہ ملا دیجئے تو یہ اخبار ہر گھنٹہ کی تازہ خبریں
آپ کو اس طرح پہونچاتا رہے گا کہ میز گھنٹی بجائے گی اور اس کے بعد
اس کی سطح پر کچھ حروف پیدا ہو جائیں گے آپ ان کو پڑھ لیجئے اور پھر وہ
فوراً ہی مٹ جائیں گے۔ میں نے کہا کہ ہے تو یہ بھی عمدہ چیز خاص طور پر
تازہ خبریں معلوم کرنے کے لئے مگر میرے خیال میں یہ بولنے والا اخبار اور
یہ انگوٹھی زیادہ دلچسپ چیز ہے۔ مسز ژرنگول کو میری یہ بات شاید پسند

نہیں آئی اس لئے کہ ان کا منہ کچھ پھول گیا اور وہ احتجاجاً اپنی دم سمیٹ کر آرام کرسی پر لیٹ گئیں۔ ژرنگول صاحب نے کہا کہ صاحب دلچسپ ہو یا نہ ہو مگر اس اخبار کا سالانہ چندہ بہت ہے حالانکہ اس میں اسی دقیانوسی طریقہ پر عمل کیا گیا ہے جس کو اگلے زمانہ والے ٹیلی ویژن کہتے تھے میں کسی ایسی چیز کا طرفدار نہیں ہو سکتا جو جدت سے خالی ہو اس میں جدت بالکل نہیں ہے بلکہ متروک چیز کو پھر جاری کیا جا رہا ہے۔ اور گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ مسز ژرنگول نے اٹھلا کر کہا کہ آپ کی بلا سے آپ میرے نام یہ اخبار جاری کرا دیجئے۔ ژرنگول صاحب نے پھر اپنی اقتصادی مشکلات کا ذکر اور اپنی بیگم صاحبہ سے رحم کی اپیل کی مگر وہ تو گویا اس اخبار کی خریداری کے لئے بالکل ہی طے کئے بیٹھی تھیں آخر جل کر بولیں کہ میں اپنے ناشتہ سے ایک آدھ چیز کم کر سکتی ہوں۔ اپنے لباس میں سے ایک آدھ چیز چھوڑ سکتی ہوں۔ اپنا بولنے والا اخبار بند کرا سکتی ہوں مگر اس میز والے شیشہ کے اخبار کو ضرور خریدوں گی۔ میری جو شامت آئی تو میں نے کہہ دیا کہ صاحب آپ کو اختیار ہے آپ جو چاہے کریں مگر اس بولنے والے اخبار کو نہ بند کرائیں۔ بس جناب وہ نیک بخت مجھ پر برس پڑی کہ آپ کیا جانیں اور آپ کو کیا معلوم کہ مجھ کو اس اخبار کا کس قدر شوق ہے اور اگر میرا یہ شوق پورا نہ ہوا تو میرا وزن کس قدر کم ہو جائے گا اور مجھ کو کس شدت کے ساتھ نزلہ ہو جائے گا۔ آپ ایک دوسری دنیا کے رہنے والے آپ ہمارے معاملات میں کیوں دخل دے رہے ہیں۔ محض آپ کے

دخل دینے کی وجہ سے مجھ کو اتنی سی دیر میں تین مرتبہ چھینکیں آ چکی ہیں ۔ مسز
تز رنگول کے اس غصہ سے زیادہ میں اس بات پر حیران ہوں کہ آخر اس
شوق کے پورا نہ ہونے سے ان کو شدت کے ساتھ نزلہ کیوں شروع ہوجائیگا۔
اور میرے دخل درمعقولات پر ان کو تین مرتبہ چھینکیں کیوں آئیں ۔
بہرحال ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے میں نے مسز تز رنگول سے معافی
مانگی اور اپنے الفاظ واپس لئے یہاں تک کہ جب وہ اپنے شوہر کی طرف
دنیا سے منہ پھیر کر گرجنے لگیں تو میری جان میں جان آئی ۔ آخر کار اس عورت
نے اپنے شوہر سے وعدہ لے ہی لیا کہ سبز والا شیشہ کا اخبار آجائے گا ۔ اور
اس غریب نے بھی اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ چپکے سے راضی ہو گیا ۔ مختصر یہ
کہ معلوم یہ ہوا کہ اس معاملہ میں دنیا اور مریخ دونوں جگہ کے مردوں کے لئے
سعادت مندی بہت ضروری چیز ہے ۔ خیر صاحب خدا خدا کرکے یہ طوفان
ختم ہوا ۔ اور قیامت نے دم لیا ۔ بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب
مسز تز رنگول تشریف لے گئیں تو تز رنگول صاحب نے نہایت عاجزی کے
ساتھ مجھ سے کہا کہ میں نے اگر ان کی بیوی کی باتوں کا کوئی ناگوار اثر لیا ہو
تو معاف کر دوں ۔ میں نے اس کے جواب میں ان سے کہا کہ جناب والا اس
معاملہ میں مجھ کو آپ سے روٹھنے کی گنجائش تو اس وقت ہوسکتی تھی جب میں
تنہا آیا ہوتا ۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ میں بھی اپنے ساتھ بیوی کو لایا ہوں ۔
اور ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دن آپ کو نہ ڈانٹ دیں ۔ بہرحال
اگر کبھی اس کی نوبت آجائے تو آپ میری ہی طرح فراخ دلی سے کام لے کر گویا

اثر نہ لیجئے گا۔ ژرنگول صاحب ہنسنے لگے اور ان کی ہر ہنسی کے زور میں دم پھڑپھڑانے لگی۔ آخر میں نے ذرا نرم آواز کے ساتھ پوچھا کہ کم سے کم یہ بتا دیجئے کہ مسٹر ژرنگول نے اپنے اس شوق کے پورا نہ ہونے کی صورت میں نزلے کے امکان اور میرے دخل در معقولات پر چھینکوں کا ذکر کیوں کیا تھا۔ ژرنگول صاحب نے بے پروائی سے کہا کہ بات یہ ہے کہ وہ فوراً ہر بات کا اثر اپنے دماغ پر لیتی ہیں اور ان کو نزلہ یا چھینکیں کیا بڑے سے بڑا دماغی مرض پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہماری دنیا میں تو دل پر اثر لیا جاتا ہے۔ ژرنگول صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ معاف کیجئے گا آپ کی دنیا میں تو ہر بات الٹی ہی ہوتی یا شاید وہاں دماغ سینہ میں اور دل کھوپڑی میں ہوتا ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی تردید کروں مگر چونکہ ثابت کرنا ذرا مشکل تھا لہٰذا صرف سر کھجا کر رہ گیا۔

آج میری گھڑی میں جون ۱۹۵۰ء کی دوسری تاریخ ہے اور میں سخت پریشان ہوں اس لئے کہ میں ایک عجیب و غریب حادثہ کا شکار ہو کر سخت مجروح ہو گیا ہوں۔ چوٹ کی تکلیف الگ ہے اور مریخ کا طریقہ، علاج علیحدہ ناک میں دم کئے ہوئے ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ پرسوں رات کو موسم کچھ ایسا تھا کہ بے اختیار نہانے کو دل چاہا اور اس بے ساختہ خواہش نے ایسا بدحواس کیا کہ اپنا مریخ میں ہونا بھول کر میں نے جو ایک جست شفاف پانی کی لہروں میں لگائی تو آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا، دماغ چکر کھا گیا اور ہڈی پسلی چکنا چور ہو کر رہ گئی پہلے تو میں اُف کر کے دم بخود ہو گیا

اس کے بعد جب ہوش میں آیا تو میری یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اتنے دن مریخ میں
رہتے ہوئے ہو گئے، لیکن آج تک میں یہاں کی خشکی اور تری کا فرق نہیں
سمجھ سکا اور جسے میں نے شفاف پانی کا چشمہ خیال کر کے جست لگائی تھی وہ
نہایت سخت قسم کی زمین تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹانگ الگ ٹوٹی اور دانت
الگ غائب ہوئے یہ سب تو گویا شدید چوٹیں ہیں رہ گئیں خفیف ضربیں وہ
تو متعدد آئی ہوں گی اور خود ہی ٹھیک بھی ہو گئی ہوں گی۔ خیر یہ تو ایک
اتفاقی حادثہ ہے جس کا تعلق براہ راست اپنی ذاتی حماقت سے ہے مگر
یہاں اب جو تیاریاں اور تیمارداریاں ہو رہی ہیں خدا ان سے دشمن کو
بھی محفوظ رکھے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ یہاں سب سے بڑے عنایت فرما
جناب ڈرنگول ہیں چنانچہ ان کو جیسے ہی اس حادثہ کی خبر ہوئی فوراً ایک
کلہاڑی نما ہتھیار لے کر دوڑے اور بغیر مشورہ کئے میری اس ٹانگ کو
کاٹ دینے کا ارادہ فرمایا جس میں چوٹ آئی تھی مگر میں نے گھبرا کر ان کا ہاتھ
پکڑ لیا اور پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ان کو میرے اس سوال پر سخت
حیرت ہوئی اور میری طرف گھور کر کہنے لگے "اسی پیر میں چوٹ آئی ہے
نا؟" میں نے کہا کہ "ہاں چوٹ تو اسی پیر میں ہے مگر یہ کلہاڑی؟" وہ
میری بات کاٹ کر کہنے لگے کہ "صاحب! اس کو فوراً کٹوائیے ورنہ اس سے
تو آپ کا تمام جسم سڑ جائے گا اور پھر اس کا علاج بھی نہ ہو سکے گا"
میں نے اپنا پیر باوجود درد کے سمیٹتے ہوئے کہا کہ ——— "معاف فرمائیے
جناب میرا جسم بھی کوئی مچھلی کا ہے جو سڑ جائے"، کہنے لگے "جناب آپ کا جسم

مچھلی کا ہو یا کچھوے کا مگر مریخ کی آب و ہوا کا اثر یہ ہے کہ چوٹ والا حصہ اگر فوراً
کٹوا نہ دیا جائے تو پورا بدن فوراً سڑ جاتا ہے، پیر کٹوا لیجئے، میرا کہنا مانئے
ورنہ مجھے بھی افسوس ہوگا اور آپ بھی پشیمان ہوں گے۔ میں اس کے
جواب میں خدا جانے کیا کہنے والا تھا کہ مسٹر ژرنگول کی عورت یعنی مسز
ژرنگول بھی آپہونچیں اور آتے ہی اپنے شوہر نامدار سے پوچھا کہ کاٹ دیا
ان کا پیر؟" ژرنگول صاحب نے جز بز ہو کر کہا کہ "نہیں صاحب یہ دنیا
کے لوگ عقل کے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بھلائی
کر رہا ہوں اور ان کا پیر کاٹنا چاہتا ہوں مگر یہ ہیں کہ مجھ کو اپنا دشمن
سمجھتے ہیں۔" میں نے جلدی سے کراہتے ہوئے کہا کہ "نہیں صاحب یہ
بات نہیں ہے۔ بلکہ قصہ دراصل یہ ہے کہ آپ میرا صحیح علاج نہیں کر رہے
ہیں۔ آپ مجھ کو اسپتال لے کر چلیں وہاں ڈاکٹر جو کچھ کہے گا مجھ کو اس میں
کوئی عذر نہ ہوگا۔ مسز ژرنگول نے یہ سنتے ہی ایسا احمقانہ قہقہہ لگایا کہ
میں اپنا درد بھی بھول گیا اور ان کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ برابر نہایت خوفناک
ہنسی ہنس رہی تھیں اور ان کی دم تو گویا پچھاڑیں کھا رہی تھی مجھ کو تعجب
سے سوالیہ نشان بنا ہوا دیکھ کر ژرنگول صاحب نے کہا کہ واقعی ہنسی کی
بات ہے کہ چوٹ کا علاج آپ اسپتال میں کرانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی گویا
جھوٹ بولنے، چوری کرنے، چغلی کھانے یا بے ایمانی کرنے کی کوئی عادت
ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ان حضرت کے بیان سے میرا تعجب دور ہو جائیگا
مگر ان کے بیان سے تو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہاں کے اسپتالوں میں

امراض کا نہیں بلکہ بری عادتوں کا علاج ہوتا ہے مگر اس سے قبل کہ میں ان سے کچھ دریافت کروں ٹز رنگول نے مجھ سے دریافت کیا کہ دنیا کے ڈاکٹر ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور دانتوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں نے ایک آہ کے ساتھ حامی بھری۔ ٹز رنگول نے کہا کہ مریخ میں اس قسم کی شکایتوں کا علاج یہاں کے ماہر بڑھئی انجام دیتے ہیں مسٹر ٹز رنگول کی بے محل ہنسی پر مجھے سخت قسم کا غصہ آ رہا تھا لیکن ٹز رنگول مرد ہونے کی بنا پر ذرا اعلیٰ قسم کا جانور ہے لہٰذا اس نے انسانی اخلاق کے ساتھ کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ ہمارے مریخ میں اس قسم کی ٹوٹ پھوٹ کا کام ڈاکٹروں سے متعلق نہیں ہوتے اور نہ یہ مرمت اسپتالوں میں ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے تو فیکٹریاں اور کارخانے کھلے ہوئے ہیں جہاں بڑے بڑے ماہر بڑھئی یہ خدمات انجام دیتے ہیں، رہ گئے ڈاکٹر، وہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی علاج میں مہارت رکھتے ہیں۔ کیا آپ کی دنیا میں ان بڑھئی قسم کے کاریگروں کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ جب ہی آپ اس طرح حیرت سے منہ کھولے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ صاحب بات تو یہی ہے مجھ کو سخت حیرت ہو رہی ہے اور میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ میں کسی ڈاکٹر کے متعلق یہ سنوں کہ وہ بڑھئی ہوتا ہے مگر خیر میں اس وقت ڈاکٹر اور بڑھئی کا فرق معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ تکلیف کی وجہ سے میرا دم نکلا جاتا ہے، مجھ کو آپ فوراً کسی بڑھئی کے پاس لے چلیں حالانکہ میں شیشم یا دیودار کا بنا ہوا نہیں بلکہ گوشت پوست اور ہڈیوں کا بنا ہوا انسان ہوں۔ مسٹر ٹز رنگول

نے منہ پھلا کر کہا کہ یہ کیا بات ہوئی میں نے جل کر جواب دیا کہ آپ کو اس کے سمجھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس کو سمجھنے کے لئے جس قسم کی عقل کی ضرورت ہے وہ صرف دنیا کی آب وہوا میں پائی جاتی ہے پھر میں نے مسٹر ژرنگول سے گھبرا کر کہا کہ خدا کے لئے آپ مجھے جلد از جلد بقول خود کسی بڑھئی کے پاس لے چلیئے۔ ژرنگول صاحب نے کہا کہ جناب والا! میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر آپ اسی حالت میں کسی قابل بڑھئی کے یہاں گئے تو وہ آپ کو اور مجھ کو دونوں کو بے وقوف بنائے گا اور ممکن ہے کہ اتنی دیر میں چوٹ اتنی پھیل جائے کہ ابھی تو صرف آپ کی ٹانگ ہی کاٹی جارہی ہے اس کے بعد کہیں آپ کا نصف جسم ہی نہ کاٹ دینا پڑے میں نے کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ خدا کے لئے ایسے کلمے زبان سے نہ نکالو میرے نزدیک مرنا اس سے بہتر ہے۔ البتہ مجھ کو اب جلد کسی ڈاکٹر یا بڑے ماہر بڑھئی کے پاس لے چلو تاکہ میری تکلیف کچھ تو کم ہو۔ ژرنگول نے میری درخواست پر اس کم بخت کلھاڑی کو ایک طرف رکھ دیا اور اس کے بعد ایک اڑنے والی کرسی پہ مجھے بٹھا کر ایک انسانی اعضاء کی مرمت کرنے والی ورکشاپ میں لے گئے۔ وہاں ایک بڑھئی موجود تھا۔ دوکان میں قسم قسم کے آلات موجود تھے۔ وہاں ایک حضرت بیٹھے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ حضرت میرا علاج کریں گے مگر میں چپ تھا اور درد کی جان لیوا تکلیف کے باوجود حیرت سے ایک ایک چیز کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں

ژرنگول صاحب کی دُم سے دم ملائے ہوئے میرے معالج صاحب تشریف لائے اور مجھ کو دیکھ کر مریخستانی زبان میں کہا کہ آپ کے جب چوٹ آگئی تھی تو آپ نے فوراً پیر کیوں نہ کٹوا دیا۔ اب تک تو میں صرف ژرنگول کو بے وقوف سمجھ رہا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ یہاں سب ایسے ہی عقل کے دشمن بستے ہیں مگر کرتا تو کیا کرتا تکلیف کی وجہ سے ان معالج صاحب کو منہ چڑھا کر چپ ہو رہا۔ ان حضرت نے پہلے ٹھونک بجا کر میرا پیر دیکھا پھر ژرنگول صاحب سے کہنے لگے کہ دیکھو نیا میں نے بن جائے گا، مگر دو تین دن لگیں گے۔ ژرنگول صاحب نے کہا کہ دو تین دن تو بہت ہوئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان بیچارے کے دنیوی حساب سے یہ مہینوں کا قصہ ہے۔ معالج نے اپنی دم اٹھا کر کہا کہ مجبوری ہے اس لئے کہ اگر دم لگانے کا معاملہ ہوتا میں ابھی دم لگا دیتا۔ میرے یہاں ہر سائز ہر ڈیزائن اور ہر قسم کی دمیں کثرت سے موجود ہیں مگر یہ ہے پیر خاص طور پر اس کے لئے پہلے تو سانچہ بنوانا پڑے گا اس کے بعد لکڑی کو گوشت بنانے میں کافی عرصہ لگتا ہے اور وہ گوشت بھی دنیا والوں کے گوشت کی طرح کا ہوگا ورنہ مریخی باشندوں کے لئے جو گوشت استعمال ہوتا ہے وہ تو میرے پاس منوں موجود ہے۔

ژرنگول صاحب نے کہا کہ آخر اتنے دن یہ بیچارے کس طرح رہیں گے ان کو سخت تکلیف ہے۔ اس کے جواب میں بڑھئی نے مجھ سے پوچھا کہ کہئے تو آپ کے دم لگا دوں، نہایت مضبوط بھی رہے گی اور خوبصورت

جی! میں نے گڑگڑا کر جلدی سے کہا کہ نہیں جناب میں لنڈورا ہی بھلا دم آپ کو مبارک رہے۔ معالج صاحب نے غور و فکر کے لئے اپنی دم سمیٹتے ہوئے کہا۔ پھر آخر کیا کیا جائے۔ ژرنگول صاحب نے کہا کہ ان کو صرف اپنے درد کا خیال ہے اگر وہ کسی صورت سے دُور ہو جائے تو یہ مطمئن ہو جائیں گے۔ معالج نے فوراً جواب دیا کہ بس اتنی سی بات ہے۔ اس کا علاج تو ابھی ہو جائے گا۔ میں ابھی ان کی ٹانگ کاٹے لیتا ہوں اور جو خراب حصہ ہے اس کو نکالے دیتا ہوں۔ آپ ان کی ٹانگ یہیں چھوڑے جائیے میں کوشش کروں گا کہ جس قدر جلد ممکن ہو درست ہو جائے لیکن اگر ٹانگ بالکل بدلنا پڑی تو واقعی عرصہ لگے گا۔ میں نے ٹانگ کٹنے کے خیال سے گھبرا کر کہا کہ صاحب اس میں تو اور بھی تکلیف ہوگی۔ معالج نے تعجب سے پوچھا کہ اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور معلوم نہیں کیا غیر محسوس حرکت کی کہ اب جو دیکھتا ہوں تو میں اپنی جگہ پر تھا اور میری ٹانگ معالج کے ہاتھ میں تھی نہ ٹانگ کٹنے کا درد ہوا نہ خون بہا البتہ کچھ ہلکا ضرور ہو گیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ کسی ریاضی کے ماہر نے مجھ میں سے ¼ گھٹا کر مجھ کو ¾ بنا دیا ہے۔ میں نے تعجب سے کہا کہ ایں یعنی کٹ گئی ٹانگ؟ ژرنگول صاحب نے ہنس کر جواب دیا اور نہیں تو کیا پہاڑ کا کھودنا تھا یا ترکاری کاٹنا تھی۔ معالج نے میری ٹانگ کو گھما پھرا کر دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نئی ٹانگ نہ بنانا پڑے گی بلکہ اسی میں کاٹ پیٹ کر مرمت ہو جائے گی۔ یہ ٹانگ ابھی

مضبوط ہے البتہ اس کو چھوڑ جائیے تاکہ میں کاریگر کو دے دوں۔ معالج کے اس اطمینان دلانے سے یکسوئی تو ضرور ہو گئی مگر سوال یہ تھا کہ اس عرصہ میں چلیں پھریں کیونکر غالباً ژرنگول صاحب میرا مطلب سمجھ گئے اور اس سے پہلے کہ میں معالج سے کہوں انھوں نے خود ہی کہا کہ ان کو فکر یہ ہے کہ اس عرصہ میں چلیں پھریں گے کیونکر معالج نے کہا کہ اس مریخ میں ان ٹانگوں سے چلنا تو یوں بھی مشکل ہے بہرحال اگر کہئے تو دوسری ٹانگ بھی نکال کر عارضی طور پہ دم لگا دوں۔ پھر جب ٹانگ درست ہو جائے گی تو دم واپس کر دیجئے گا۔ ممکن ہے کہ معالج نے ازراہ ہمدردی یہ کہا ہو مگر میں کیا کروں کہ مجھ کو دم لگوانے کے خیال سے ہی شرم آتی تھی اور یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ جو دم کی کسر تھی وہ بھی آج پوری ہو رہی ہے۔ مجھ کو ایک ٹانگ سے اچکنا گوارہ تھا مگر دم کی طرف طبیعت مائل نہ ہوتی تھی مگر ژرنگول صاحب کے اصرار نے مجبور کر دیا اور آخر میں نے اپنی دوسری ٹانگ بھی کٹوا دی۔ اب میں بالکل پیر ویٹ یا بوا معلوم ہوتا تھا اور میز پر رکھا ہوا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں اس بڑھئی نے ایک چکدار دم میرے فٹ کر دی اور مجھ سے کہا کہ اترو میز کے اوپر سے میں نے ہاتھوں کی مدد سے اترنا چاہا مگر میرے معالج نے مجھ کو روک دیا اور کہا کہ دم پر زور دو مجھے یہ ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کہیں اوندھے منہ پھر نہ گروں اور اب تک تو دانتوں کا ٹوٹنا خیر چھپا یا ہے۔ اب کہیں یہ راز نہ کھل جائے اور جس طرح میری ٹانگ مرمت کے لئے کارخانہ میں رکھ لی گئی ہے اسی طرح کہیں منہ

بھی نہ رکھ لیا جائے۔ مگر معالج کے کہنے سے میں نے دم پر زور جو دیا تو معلوم ہوا کہ دم خود بخود مجھ کو چلا رہی ہے اور میں چل کیا رہا ہوں گویا تیر رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ دم ذرا بدصورت چیز ہے اور اس میں مذاق کا ایک پہلو نکلتا ہے ورنہ یہاں چلنے پھرنے کے لئے ٹانگوں سے زیادہ مفید ہے۔ بہر حال مجھ کو دم کے سہارے چلتا دیکھ کر نہ تو معالج کو تعجب ہوا نہ زرنگول صاحب کو، البتہ جب میں گھر پہونچا تو بیگم نے دیکھتے ہی ایک باری کہا کہ اے ہے یہ کیا ہوا؟ میں نے اُن کو اس حادثہ کی تفصیل سنائی اس لئے کہ حادثہ کے وقت وہ اڑنے والی چھتری لگا کر سیر کر رہی تھیں اور اب مجھ کو دمدار دیکھ کر یہ سمجھ سکتی تھیں کہ زرنگول کی صحبت میں اُن کا شوہر بھی ہاتھ سے گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی بہت حیرت کے بعد یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور اب وہ مجھ کو ہر زاویہ سے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگیں مگر مجھ کو ان کی ہنسی میں کچھ لطف نہ آیا اس لئے کہ منہ کے اندر دانت اب تک مرمت طلب پڑے ہیں اور اُن میں درد ہے

آج جون ۲۰۵۰ء کی سولہ تاریخ ہے اور میری واپسی کے انتظامات ہو رہے ہیں بچے کالج سے آگئے ہیں اور تمام سامان درست کرنے میں مصروف ہیں۔ بیگم بھی اپنے گھر جانے کے شوق میں اور مجھ کو کمزور سمجھ کر ہر کام میں ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ حالانکہ اب میں نہ کمزور ہوں نہ میرے دم لگی ہوئی ہے بلکہ اب تو میری ٹانگ مرمت کے بعد بالکل اصلی حالت میں واپس آگئی ہے

اور میں اچھا خاصا انسان معلوم ہوتا ہوں۔ کسی اور کو تو کیا خود مجھ کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ایسی سخت چوٹ آئی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مریخ کی زمین پر چند دن دم لگا کر چلنے پھرنے کے بعد اب میں اپنی اصلی ٹانگوں سے بالکل اس طرح چل رہا ہوں جس طرح بچے چلنا سیکھتے ہیں اور ان کی لڑکھڑائی ہوئی چال پر اُن کی مائیں دلار سے مثلاً تتلا کر کہتی ہیں میّوں میّوں مگر اس خیال سے یہ تو ہونے سے رہا کہ میں اپنی ٹانگیں اٹھا کر طاق پر رکھ دوں اور مستقل طور پر دم لگائے پھروں خیر اس مریخ میں تو اتنے دن بھی دم لگی رہی اگر دنیا میں ہوتے تو جس طرف سے نکل جاتے لڑکے تالیوں پر اڑاتے اور "ڈابل میں دم لگی ہے" کا شور دم کے ساتھ ساتھ ہوتا پھر بھی میرا ارادہ یہ ہے کہ اس دم کو واپس نہ کروں بلکہ اپنے ساتھ اس حادثہ کی یادگار کے طور پر لیتا چلوں اور جس وقت دنیا کے اخباروں میں اپنے مریخ کے سفر کے حالات لکھوں، ان میں اس دم کی تصویر بھی پیش کروں اور اپنی وہ تصویر۔ ان حالات کے ساتھ ہی ساتھ شایع کراؤں جو دُم لگنے کے بعد ژرنگول صاحب نے کھینچی تھی۔ بہرحال میں نے بیگم سے خاص طور پر اس دم کو احتیاط سے رکھنے کی ہدایت کر دی ہے حالانکہ ان کو اس دم سے خدا جانے کیوں نفرت ہے اور وہ اس کو دیکھتے ہی نہایت برا منہ بناتی ہیں مگر میرے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ ژرنگول صاحب کو میرے جانے کا بہت افسوس ہے اور وہ کچھ مرجھائے ہوئے سے نظر آرہے ہیں۔ مسز ژرنگول کو نہ ہم لوگوں کے آنے کی خوشی تھی نہ ہم لوگوں کے جانے کا غم ہے۔ البتہ اُن کو برا

یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہم لوگوں کے لئے ان کو تین دن کے ناشتہ کا انتظام کرنا ہے ۔ حالانکہ یہ کوئی اگلا وقت تو ہے نہیں کہ پورا ٹفن کیریر اپرا بھرا جائے اور اس کو ایک اچھے خاصے بستر کی طرح لادیئے لادے پھریئے ۔ اب تو تین دن کا ناشتہ کیا معنی ایک مہینے کی خوراک ایک دیا سلائی کی ڈبیہ میں رکھکر جیب میں رکھی جا سکتی ہے ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ژرنگول صاحب نے یہ کہہ دیا ہے کہ ان مخصوص کھانے کی گولیوں کے بجائے جو بازار میں بکتی ہیں چند خاص خاص مریخی کھانے ناشتہ میں ضرور دکھائے جائیں ۔ مثلاً وہ شکار جو بندوق میں مسالہ بھر کر کیا جاتا ہے اور پھر اس کو پکانے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ وہ پلاؤ جس کا صرف ایک چاول کھا کر پیٹ بھر جاتا ہے اور وہ مکھن ٹوسٹ جس کو ایک مرتبہ کھا کر ایک مہینے تک بھوک نہیں لگتی اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کھانا کھایا ہے سب سے پہلے مسز ژرنگول نے اپنی محنت بچانے کے لئے یہی کہا کہ ناشتہ کی ضرورت ہی کیا ہے یہی ٹوسٹ کھلا کر سب کو روانہ کر دیا جائے مگر ژرنگول صاحب نہ مانے اور اپنی بیوی کو ناشتہ کی تیاری میں مصروف کر دیا ۔ ادھر میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا یہی غور کر رہا ہوں کہ مریخ سے آخر کیا کیا چیزیں لے چلوں یوں تو یہاں کی ہر چیز عجیب و غریب ہے اور لے جانے کو پورا مریخ لے جانا چاہیئے مگر میں محض اسی قدر چیزیں لے جانا چاہتا ہوں جو راکٹ میں آجائیں چنانچہ سب سے پہلے ژرنگول صاحب سے کہا کہ آپ مجھے وہ اخبار پڑھنے والی انگوٹھی منگا دیں جو مسز ژرنگول کے پاس ہے ۔ ژرنگول صاحب نے کہا کہ یہ انگوٹھی آپ

کے لئے اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ آپ کے پاس وہ اخبار بھی نہ ہوں جن کے لئے وہ انگوٹھی بنائی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اس اخبار کا کوئی پرانا پرچہ لیتا جاؤں گا۔ مجھ کو تو صرف اپنی دنیا کے لوگوں کو یہ عجیب وغریب انگوٹھی دکھانا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ میرا مقصد نہیں ہے۔ ٹررنگول صاحب نے کہا کہ جناب والا آپ کو یہ انگوٹھی مل ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ یہ تو اخبار کے مستقل خریداروں کو دی جاتی ہے کوئی بازار میں بکنے والی چیز تو ہے نہیں کہ میں منگا دوں اور آپ لے جائیں۔ میں نے کہا کہ میں اخبار کا سالانہ چندہ داخل کئے دیتا ہوں۔ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ اخبار بھی جاتا رہے گا اور آپ کی اس دنیا کے حالات بھی معلوم ہوتے رہیں گے۔ ٹررنگول صاحب نے پہلے تو اپنی دم سمیٹ کر کچھ غور کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد یکایک اپنی دم پھیلا کر کچھ تھوڑا سا اُچھلے اور تالی بجا کر کہنے لگے کہ ایک بڑی عمدہ ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ اس اخبار کے دینوی نمائندہ کیوں نہ بن جائیں میں ابھی اخبار کے ایڈیٹر کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔ وہ یقیناً اس کو فوراً منظور کرلیں گے اور اچھی خاصی رقم بھی ملے گی۔ مجھ کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا۔ چنانچہ فوراً ٹیلیفون کیا گیا اور اس انگوٹھی والے اخبار کے ایڈیٹر نے اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ میں چاہتا تھا صرف انگوٹھی مگر اس اخبار کی طرف سے انگوٹھی تو خیر مل ہی گئی اس کے علاوہ ایک ایسا معاوضہ بھی نامہ نگاری کے سلسلے میں طے ہوگیا کہ جو ہماری دنیا میں

نامہ نگاروں کو کیا معنی ایڈیٹروں کو بھی نہیں ملتا۔ میں نے زرنگول صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ان سے کہا کہ اب تو مجھ کو آپ سے دو تین چیزیں اور بھی مانگنے کا حق ہو گیا۔ زرنگول صاحب نے کہا کہ وہ بھی فرما دیجئے شاید ان کے سلسلہ میں بھی آپ کا کوئی فائدہ ہو جائے میں نے کہا کہ خیر اب تو فائدہ کی کوئی امید نہیں ہے البتہ ان چیزوں کا مل جانا ہی میرے لئے بہت بڑی بات ہو گی۔ زرنگول صاحب نے بڑے اخلاق سے اپنی دم ہلا کر کہا کہ خیر آپ کہیں تو فائدہ کی صورتیں ڈھونڈھنا تو میرا کام ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو ریڈیم کے چھاپے کی کوئی کتاب منگا دیجئے جس کو میں رات کے اندھیرے میں پڑھا کروں۔ زرنگول صاحب یہ سنتے ہی پہلے تو کچھ چپ ہو گئے اس کے بعد آپ نے پھر اپنی دُم کو جنبش دی اور کہنے لگے ؎

زِ اثری زِ یاغ عزث غلغزث
عزث ول زِ بیغ عزث اں عزث

یہ مریخی زبان کا ایک شعر ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

میں نے کہا کہ آخر کچھ کہئے تو آپ نے تو شاعری میں گفتگو شروع کر دی۔ میں تو اس شعر کو اس موقع پر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ . . . کہ آپ تو ترکیب بتانے میں بھی دیر کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ فوراً یہاں سے

مشہور پبلشر مژ عان کو ٹیلیفون کیجئے اور ان سے کہئے کہ میں ایک دنیا کا باشندہ ہوں ۔ مریخ کی سیاحت کے بعد دنیا کو واپس جا رہا ہوں اور وہاں جا کر سفر نامہ لکھنے کا ارادہ ہے ۔ اگر اسے آپ شائع کرنا چاہیں تو معاملات طے کرلیں ۔ اگر مژ رعان نے یہ سفر نامہ شایع کیا تو ریڈیم کے چھاپے سے یہ کتاب چھپے گی ۔ اور دام بھی اچھے مل جائیں گے ۔ میں نے فوراً مژ رعان سے ٹیلیفون کا سلسلہ ملا کر معاملات پر گفتگو کی ۔ اور تھوڑی ہی دیر میں تمام معاملات اس حد تک طے ہو گئے کہ مجھے ٹیلیفون چھوڑے ہوئے ابھی مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ اس کمپنی کا چپراسی اپنی تمام کتابوں کی ایک ایک جلد اور سفر نامہ کی اجرت رقم پیشگی لے کر آگیا۔ یہ رقم میرے لئے تعجب انگیز تھی اس لئے کہ ہماری دنیا میں مصنفوں کو پبلشر جو رقم دیتے ہیں اس کے حساب سے یہ رقم دس گنی زیادہ تھی۔ بہر حال میں نے زرنگول صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے میں مریخ سے نہایت امیر ہو کر واپس ہو رہا تھا ۔ زرنگول صاحب نے اس شکریہ کے جواب میں کہا کہ خیر اب تک تو آپ سے اپنی مرضی کی چیزیں بنائی ہیں ۔ اب میں تحفہ کے طور پر چند چیزیں آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ ان میں سب سے پہلے اس چشمہ کو قبول کیجئے جو رات کو دن بنا دیتا ہے ۔ میں نے نہایت شکریہ کے ساتھ وہ چشمہ لے لیا پھر زرنگول صاحب نے وہ ٹارچ دیا جس کو دکھاتے ہی خط بن جاتا ہے مگر میں نے اس کو لینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اگر اس کی روشنی ادھر ادھر

پڑگئی تو داڑھی کے ساتھ مونچھ بلکہ کیا عجب ہے کہ ابرو اور سر کے بال وغیرہ بھی صاف ہو جائیں۔ ژرنگول صاحب نے کہا کہ میں اس کے ساتھ ہی داڑھی نکالنے والا آئینہ بھی پیش کرتا ہوں۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بخشئے جناب اگر کسی آئینہ کو کبھی بھولے سے بیگم نے یا کسی اور عورت نے دیکھ لیا تو مصیبت ہی آجائے گی ژرنگول صاحب ہنسنے لگے اور ان چیزوں کو علیحدہ رکھ کر کہنے لگے کہ اچھا تو اب آپ آرام کرسی سے اٹھیں اس لئے کہ راکٹ تیار کھڑا ہے اور آپ کا سب سامان اس پر پہنچ چکا ہے۔ میں تو تیار تھا ہی فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور مسز ژرنگول سے ملنے ان کے کمرے کی طرف چلا۔ اور ژرنگول صاحب سے نہایت خلوص کے ساتھ ناک رگڑ کر اور مسز ژرنگول کو دور ہی سے سلام کر کے رخصت ہوا۔ ژرنگول سلمہٗ مجھ کو راکٹ تک پہونچانے آیا اور آخر جب راکٹ روانہ ہوا ہے تو وہ بیچارہ دیر تک دُم ہلاتا رہا۔

قوم

قوم کے اعتبار سے میں ذرا یوں ہی سا ہوں ۔ یوں ہی سا کا مطلب یہ کہ ہمارے بزرگوں میں ایک صاحب بندر نچاتے تھے، مگر اس فن کے استاد سمجھے جاتے تھے ۔ بڑے بڑے مداری ان کا نام لے کر ڈگڈگی اٹھایا کرتے تھے ۔ اور عجیب صلاحیت خداوند کریم نے ان کو عطا فرمائی تھی کہ کیسا ہی بیوقوف سا بے وقوف بندر کیوں نہ ہو دو چار ہی دن میں اس کو ڈگڈگی اور لاٹھی کے اشارے سے بندریا سے روٹھنا، دھن بجانا ۔ آئینہ دکھانا اور پھر مونڈھے پر بیٹھ کر ٹوپی پہننا سکھا دیتے تھے ۔ اللہ بخشے دادی جان کہا کرتی تھیں ۔ کہ دور دور سے بندر والے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے لئے آیا کرتے تھے ۔ اور وہ بندر جو بڑے نامی گرامی بندر والوں سے نہ سدھ سکیں ان بندروں کو تھوڑی ہی سی توجہ سے ہمارے یہ بزرگ سدھا دیا کرتے تھے ۔ نہ تو ہئے کہ کچھ نشہ کرتے تھے یہ بزرگ، ان کو چانڈو وغیرہ سے شوق تھا ۔ ورنہ ان کی کمائی سے تو اب تک سب مالا مال ہوتے ۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ایک آنہ فی ناچ ۔ اور دن بھر میں پچاس ساٹھ ناچ، گویا تین روپئے روز

کے رئیس تھے۔ مگر ساتھ ہی ٹھاٹھ بھی ان کا رئیسانہ تھا۔ جو کمایا سب نشہ پانی میں اڑا دیا۔ مگر اللہ رکھی وفادار بیوی کہ جب میاں حکومت کے باغیوں میں سمجھے گئے اور چانڈو خانہ کے ایک ہنگامہ میں پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا تو اس نیک بیوی نے روضہ بی بی کا، دکھانا شروع کر دیا۔ اور کسی اپنے بیگانے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ دادی جان مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ جس وقت یہ محترمہ چلچلاتی دھوپ میں دوپہر کے وقت روضہ کی گٹھری پیٹھ پر لاد کر اور مور کی دم کی جھاڑو تھا ایک چھڑے کر روضہ بی بی کا دیکھو یا نبی رسول اللہ کی صدا بلند کرتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دوپہر کا سناٹا لرز رہا ہے۔ رعب کا یہ عالم تھا کہ یہ صدا سنتے ہی عورتیں اپنے بچوں کو لپٹا لیتی تھیں۔ اور ایسی گھر والیاں جو تنہا ہوں دوڑ کر دروازے کی زنجیر لگا دیتی تھیں۔ کوئی کہتا کہ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔ کسی کا اعتقاد تھا کہ سر کاٹ جھولے میں ڈال لیتی ہے۔ مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو روضہ دیکھنے کی سعادت حاصل کرتے تھے اور وہ کتاب نہایت عقیدت سے دیکھتے تھے جس میں ہر صفحہ پر ایک نہ ایک واقعہ کی تصویر ہوتی تھی۔ مثلاً ملک الموت کی تصویر جن کے پچاس ہاتھ اور ہر ہاتھ میں کوئی نہ کوئی خوفناک ہتھیار کسی میں چاقو کسی میں تلوار کسی میں بھالا۔ کسی میں سانپ آنکھیں نکالے سر پر سینگ لگائے بیٹھے ہیں۔ یا مہندی کی ایک جھاڑی کی تصویر جس کے متعلق وہ نہایت عبرت انگیز انداز سے فرمایا کرتی تھیں کہ "یہ مہندی بی بی فاطمہ کی۔ شریفوں نے چھوڑی۔ ڈومنی چمارن نے پیروں میں لگائی۔ مہندی کی لالی گئی۔ پھولوں کی

باس اڑی ہی"

ایک تصویر تھی محض لوٹے کی، جی ہاں لوٹا یہی ٹوٹی والا لوٹا جس سے ہم آپ سب ہاتھ منہ دھوتے ہیں مگر آج تک کسی کو یہ خیال نہ پیدا ہوا ہوگا کہ لوٹے کی تصویر بھی کھنچوائیں جس وقت یہ لوٹے والا صفحہ آتا وہ نہایت فصاحت سے فرماتی تھیں "یہ لوٹا امام حسین کا۔ کربلا میں قطرے قطرے کو ترسے قیامت میں قطرے قطرے کا حساب دینے کو لوٹے سے قطرے قطرے کا حساب رکھ کر پانی بہایا۔ کربلا میں پانی نہ پایا جنت میں کوثر بہایا۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی تقریباً بیس تصویریں تھیں اس کتاب میں جو اب تک ہمارے خاندان میں محفوظ ہے۔

بس یہ ذرا سی کھوٹ ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے اور قوم کچھ اسی قسم کے بزرگوں کی وجہ سے ذرا گڑ بڑ سی ہو گئی ہے ورنہ بعد میں تو ہمارے خاندان نے بڑی ترقی کی۔ ہمارے دادا جان رحمتہ اللہ علیہ کو ایک انگریز نے بندر پکڑنے پر نوکر رکھ لیا۔ یہ انگریز بندر پکڑ پکڑ کر ولایت بھجوایا کرتا تھا۔ اور فی بندر دادا جان کو چار آنے دیا کرتا تھا کچھ دنوں کے بعد تو ایک روپیہ بندر کا ریٹ مقرر ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دادا جان ہر روز دس پندرہ بندر پکڑ لیا کرتے تھے یعنی دس پندرہ روپئے پکڑ لیا کرتے تھے۔ آدمی تھے سوجھ بوجھ کے کچھ ہی دنوں میں یہ ترکیب سمجھ میں آ گئی اور دوسرے عزیزوں کو بھی اس کام پر لگا دیا جو عزیز بندر پکڑ کر لائے آپ اس کو چار آنے فی بندر کے حساب سے ادا کر دیں اور انگریز سے ایک روپیہ فی بندر وصول

کریں۔ اب تو کبھی سو کبھی سوا سو روپئے روز کی آمدنی ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس انگریز نے ان کو ٹھیکہ دے دیا اور خود وہ کلکتہ چلا گیا۔ دادا جان کو اس کام میں اللہ نے اتنی ترقی دی کہ دو تین سال کے اندر وہ لکھ پتی ہو گئے۔ والد صاحب کو خاندانی مشغلہ سے علیحدہ رکھ کر تعلیم دلانا شروع کر دی۔ اور آخر کار ان کو گریجویٹ کرا دیا۔ دادا جان کے انتقال کے بعد والد صاحب نے بندروں کا کاروبار ترک کر دیا۔ اور مرغیوں اور انڈوں کی تجارت شروع کی۔ اللہ نے اس میں بھی برکت دی اور دولت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور ہم ایک بہت بڑی ریاست کے مالک بنا دیئے گئے۔

بینک میں لاکھوں جمع ہیں ـــــ کوٹھیاں کرائے پر چلتی ہیں۔ سواری کے لئے موٹر ہے۔ رہتے بھی نہایت ٹھاٹھ سے ہیں۔ نوکر چاکر سب ہی کچھ ہیں۔ ہر سوسائٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، ایک یتیم خانہ کی کمیٹی نے ہم کو صدر منتخب کر لیا ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اسمبلی کے ممبر بھی ہو جائیں گے امید ہے کہ آئندہ سال تک خطاب بھی مل جائے گا۔ مگر کچھ نہ پوچھئے کہ اس وقت ہمارا کیا عالم ہے۔ جب کسی سرکاری کاغذ کے ہر خانہ میں کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے ـــــ نام ـــ باپ کا نام ـــ قوم ـــ بس یہ خانہ نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس خانہ میں کیا لکھا کریں۔ خیر لکھنے کو تو مسلم لکھ دیا کرتے ہیں لیکن خود اپنے دل کو اطمینان نہیں ہوتا . . . . یہاں تک بھی غنیمت تھا مگر ایک فکر ہے شادی کی اور شادی جہاں ہم کرنا چاہتے ہیں وہ صاحبزادی یوں تو ہر اعتبار سے نہایت

مناسب ہیں۔ البتہ ان میں ایک عیب یہ ہے کہ ان کی قوم کچھ بے عیب سی ہے۔ اصل نسل کی شیخ زادی ہیں۔ اور شجرہ اب تک محفوظ ہے۔ ہمت نہیں ہوتی کہ ان کے یہاں پیغام بھیجا جائے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ان کے علاوہ ہم کہیں اور شادی کر لیں۔ غالباً وہ چیز ہو گئی ہے جس کو محبت وغیرہ کہتے ہیں۔ ہمارے منیجر صاحب کا خیال یہ ہے کہ ہم کو نسبت بھیج دینا چاہیئے ارادہ یہ ہے کہ آج ان سے اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔

منیجر صاحب کی رائے کے مطابق ہم نے ادھر تو نسبت بھیج دی ہے اور ادھر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان صاحبزادی سے اظہار جذبات بھی کر دیں۔ بات یہ ہے کہ ہم دونوں مسوری آئے ہوئے ہیں۔ ہر روز کہیں نہ کہیں ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ ویسے تو نہایت خندہ پیشانی سے ملتی ہیں بلکہ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت سے مل رہی ہیں، ایک آدھ مرتبہ پکنک پر بھی جا چکی ہیں۔ چنانچہ آج بھی ہم نے ان کو پکنک پر مدعو کیا تھا تاکہ اظہار عقیدت کر ہی گزریں اور اگر ان کی طرف سے عقیدت کی حوصلہ افزائی کی جائے تو اس مجاز کو حقیقت بنا کر اظہار محبت بھی کر دیں۔ چنانچہ ہم ان کے انتظار میں باہر ٹہل رہے تھے اور اظہار جذبات کے لئے مناسب الفاظ چن چن کر دماغ میں محفوظ کرتے جاتے تھے۔ مثلاً ناہید ہم دونوں کی یہ عارضی یکجائی اگر دوام حاصل کر لے"، مگر شاید وہ "دوام کو" "حبس دوام" نہ سمجھ لے۔ آخر اٹھڑ لڑکی ہی تو ہے معصوم نادان لہذا "ناہید اگر ہمارا یہ ساتھ زندگی کا ساتھ بن جائے تو"، مگر نہیں اس قدر صاف کہہ دیا تو

مریخ کی سیر

ممکن ہے کہ تھپڑ مار دے۔ ہرچند کہ تھپڑ ذرا تہذیب سے گری ہوئی چیز ہے۔ مگر بہت ہی سادہ ہے وہ لڑکی۔ کیا عجب کہ سادگی ہی میں یہ پرکاری کر بیٹھے لہذا "ناہید جب تم ساتھ ہوتی ہو تو مجھے اپنی دنیا آباد سی نظر آتی ہے۔ آخر یہ کیوں ہے" لیکن اگر وہ پوچھ بیٹھی کہ آپ ہی بتائیے کہ یہ کیوں ہے تو ہم کیا جواب دیں گے لہذا ابتدائی جملہ ایسا ہونا چاہیئے جس کا جواب ہم کو خود بھی بخوبی معلوم ہو۔

ہم کسی نتیجہ پر پہونچنے بھی نہ پائے کہ ناہید کی رکشا آگئی۔ آج وہ اور بھی قیامت تھی، بالکل بنفشہ کا پھول تاکہ ہماری محبت کا نزلہ بھی درست ہوتا رہے۔ بالوں کی ترتیب میں بھی خاص سلیقہ سے کام لیا گیا تھا، اور چہرے پر تازگی بھی آج ہر روز سے زیادہ تھی۔ ہم فوراً اس حماقت میں مبتلا ہوگئے کہ شاید ہماری نسبت، پہونچ چکی ہے اور اس کی خبر ناہید کو بھی ہو چکی ہے۔

اس نے بجلی کی طرح رکشہ سے اترتے ہوئے چہک کر کہا "اب چلیئے نا آپ تو معلوم ہوتا ہے کہ وظیفہ پڑھ رہے ہیں"

ہم نے کہا " ارادہ یہ تھا کہ گھوڑے پر جائیں گے مگر آپ باندھ کر آئی ہیں ساڑھی، یہی میں سوچ رہا تھا کہ عورتیں آخر ساڑھی کیوں باندھ لیا کرتی ہیں کہ مردوں سے ایک ہی لباس بچا رہے۔ بہرحال اب یہ سفر ڈانڈی پر یا پیدل ہوگا" اور وہ آگے بڑھ گئی۔

ہم نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا " چلیئے پیدل سہی، بھوک خوب لگے گی۔

۵۵/۷۵۴

اس نے کہا "اور سامان وغیرہ"

"ہم نے کہا۔ سب جا چکا ہے"

آبادی سے نکل کر ہم دونوں ایک سنسان گھاٹی میں خراماں تھے۔ کہ یکایک ہم کو اظہار جذبات کا خیال آیا ہر طرف ہم نے نظر دوڑائی اور اطمینان کرلیا کہ اگر جوا گا نا ہمید مار بیٹھی تو بھی دیکھنے والا کوئی نہ ہوگا اس لئے گلا صاف کر کے بہ مشکل تمام ہم نے کہا۔

"مجھ کو اس قسم کے مقامات بہت پسند ہیں"

اُس نے کہا "مجھے اس چڑیا کی دُم بہت اچھی لگتی ہے۔ کاش میں چڑیا ہی ہوتی"

ہم نے کہا "پھر میں کیا کرتا"

اس نے غور سے ہم کو دیکھ کر کہا۔

"آپ و چڑی مار بننا پسند کرتے آپ؟"

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا دم نہیں نکلا، حالانکہ نا ہمید کے اس جملے کے صاف معنے یہ تھے کہ اس کو ہمارے خاندانی حالات کا علم ہو چکا تھا۔ ہم سٹ پٹا کر رہ گئے تو اس نے پھر کہا "یعنی چڑی مار بننا آپ کو اتنا ناپسند ہے کہ آپ چپ ہو گئے اچھا خیر جانے دیجئے میں نے اپنا چڑیا بننا ملتوی کردیا ہے۔ فی الحال"

جان میں جان آئی اور ہم نے پھر ایک چشمے کے قریب پہونچ کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے جیسے محبت کا ایک ترانہ ہے جو مسلسل ہو گیا ہے"

اس نے غور سے ہم کو دیکھ کر کہا: "بھئی، اللہ ایسی باتیں نہ کیجئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ شاعر نہ ہو جائیں۔" ہم نے ذرا رومان طاری کرتے ہوئے کہا "ناہید کبھی تم سنجیدگی سے قدرت کے ان اشاروں پر غور کرتی ہو۔"

ناہید نے کہا: "دو مرتبہ غور کیا ہے۔"

ہم نے کہا: "کب؟"

اس نے کہا: "ایک آٹھ جنوری ۱۹۵۳ء کو اور دوسری مرتبہ ۱۶ اگست ۱۹۵۴ء کو۔"

ہم نے حیران ہو کر کہا: "کیا مطلب؟"

اس نے نہایت سادگی سے کہا: "تاریخی حوالے دینے کے بعد مطلب اب میں کیا بیان کروں؟"

ہم نے جز بز ہو کر کہا: "ارے بھئی ان تاریخوں میں کیا خاص واقعات ہوئے تھے؟"

اس نے کہا: "آٹھ جنوری کو میں نے قدرت کے اس اشارے پر غور کیا تھا کہ دن کو سورج کیوں نکلتا ہے اور ۱۶ اگست ۱۹۵۴ء کو میں نے قدرت کے اس اشارے پر غور کیا تھا کہ رات کو چاند کیوں طلوع ہوتا ہے؟

ہم نے ایک قہقہہ لگا کر کہا: "بڑی شریر ہو اور اسی شرارت کا نام ناہید ہے۔"

ناہید نے سنجیدگی سے کہا: "آپ کی قدر میری نظر میں بس اسی لئے ہے کہ مزاح لطیف کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔"

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ اس نے جھوٹ کہا ہے یا سچ کہہ رہی ہے لہٰذا ہم سیٹی بجانے لگے۔

چشمے کے کنارے نہایت سرسبز و شاداب اور رومان آفریں جگہ ہمارے نوکروں نے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ گراموفون بھی کھلا ہوا رکھا تھا۔ گویا ہم یہاں صرف ریکارڈ بجانے آئے تھے۔ ناہید نے آتے ہی پہلے گراموفون کو بند کیا اس کے بعد ہم دونوں نے چشمے کے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور تھکن دُور کرنے کے لئے دونوں ذرا لیٹ گئے اس کے بعد کھانا کھایا اور اب وہ ضروری کام باقی رہ گیا تھا جس کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ یعنی اظہار تمنا۔ لہٰذا ہم دونوں چلے تو بالکل چوٹی پر چڑھ گئے اس کے بعد ہم نے پھر موقع ڈھونڈھکر کہا۔

"میرا کوئی خط پہونچا ہے۔ تمھارے یہاں"

" ناہید نے کہا۔" جی ہاں"

ہم نے کہا۔" جی ہاں کے بعد بھی تو کچھ کہا ہوتا"

ناہید نے کہا۔" اور کیا کہتی میں۔ آپ نے اتنا ہی تو پوچھا تھا دوسرے یہ کہ تفصیلات سے شاید آپ کو تکلیف ہوتی۔ ابا جان بے حد خفا ہوئے۔ ان کو پہلے تو سخت غصہ آیا۔ پھر یکایک وہ بے حد ہنسے اور آخر میں وہ خط اُٹھاکر مجھ کو دے دیا۔"

ہم نے کہا۔" پھر اب کیا ہوگا۔ میں تمھارے ابا جان کے غصہ اور ہنسی دونوں سے ڈرتا ہوں"

ناہید نے کہا۔" مگر اب تو ابا جان کے غصہ اور ہنسی کے علاوہ ان کی

لڑکی سے بھی ڈرنا پڑے گا"

ہم گرتے گرتے بچے اور ہم نے ایک پتھر سے پھسلتے ہوئے کہا "کیا ۔ کیا کہو۔ ذرا پھر تو کہو"

ناہید نے کہا "شاید تم واقعی بہت سادہ لوح ہو مجھ سے تم شادی کرنا چاہتے تھے تو ابا جان کو خط کیوں لکھا ۔ مجھ سے کیوں نہ کہا ۔ حالانکہ تم کو معلوم تھا کہ میں تم کو ناپسند نہیں کرتی ہوں"

ہم نے جلدی سے کہا "یعنی پسند کرتی ہو ۔ پھر تو ۔ تو پھر"

ناہید نے کہا "پرسوں اتوار ہے نا ۔ ابا جان اُسی دن ہم دونوں کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ کر دیں گے"

ہم نے لپک کر ناہید کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ جھاڑی سے ایک لنگور نکل کر بھاگا اور ہم اس سے آنکھ چرا گئے ۔

شادی کے بعد ہی ہم دونوں کی تصویریں اکثر انگریزی اخباروں میں نکلیں ۔ شادی میں بڑے بڑے لوگ شریک ہوئے یہ سب کچھ ہوا مگر جس بات سے ہمارا دل باغ ہو گیا تھا، وہ یہ ہے کہ ہمارا شجرہ کسی نے نہ مانگا اور نہ قوم پوچھی ۔ شادی کے بہت دن بعد ایک روز ہمارے خسر صاحب نے بیان کیا میاں صاحبزادے ہم لوگ اپنے ذاتی معمار ہیں ۔ ہم نے خون پسینہ ایک کر کے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے مجھ کو معلوم ہے کہ تم سالا رو بند روالے کے پوتے ہو اور تم کو شاید معلوم نہ ہوگا کہ ہمارا خاندان بھی تمھارے گاؤں سے قریب ہی دوسرے گاؤں کا ہے ۔ ہمارے یہاں کان کا میل نکالنے کا کام ہوتا تھا ۔

تم بند روا سے اور ہم کن میلئے ۔ مگر خدا ہم دونوں کا پردہ پوش اور ہم سب سے
عالی خاندان اور ہماری قوم سو قوموں کی ایک قوم ۔ ہم نے جلدی سے
اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ملازم سُن تو نہیں رہا ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ مسز
خوش دامن صاحبہ خود اپنے کان دیا سلائی سے کرید رہی تھیں ۔

شادی کی درخواست

بعض اوقات ذرا سی شرارت بہت بڑی سنجیدگی بن جاتی ہے۔ اور خدا نہ کرے کہ وہ سنجیدگی حادثہ کی صورت اختیار کرلے۔ مگر جب کسی کی شامت ہی آگئی ہو تو وہ سنجیدگی اور حادثہ دونوں سے خالی الذہن ہو کر شرارت کر ہی بیٹھتا ہے اور آپ جانتے ہیں، کہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی اسی قسم کے آدمی کے متعلق اپنی ایک ریڈر میں فرما گئے ہیں کہ ع

ایسے نادان سے مشکل ہے سلامت رہنا

ہوا یہ کہ ایک دن یوں ہی لیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے کہ نگاہ ایک اشتہار پر پڑ گئی۔

شادی کی ضرورت

ایک حسین و جمیل سلیقہ شعار انٹرنس پاس شریف خاندان حنفی المذہب دوشیزہ کے لئے ایک ایسے بر کی ضرورت ہے جو شریف خاندان تعلیم یافتہ جوان العمر اور برسر روزگار ہو شادی شدہ یا صاحب اولاد حضرات خط وکتابت نہ کریں۔

معرفت منیجر صاحب روزنامہ خیبر لاہور

اس قسم کے اشتہار اخبارات میں چھپا ہی کرتے ہیں۔ یہ کون سی نئی بات تھی، مگر معلوم نہیں ہم کو کیا سوجھی، کہ بیگم کو بلا کر اشتہار سناتے ہوئے کہا۔

"کہئے کیا کہتی ہیں آپ ؟"

بیگم نے ہنس کر کہا "بھیجئے نا خط۔ میں کیا روک رہی ہوں"

ہم نے کہا "سنا بھی کہ شادی شدہ یا صاحب اولاد حضرات خط و کتابت نہ کریں۔

بیگم نے کہا "مگر کیا خبر ہو گی، کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے"

ہم نے کہا "اچھا لاؤ، ذرا میرا قلم، یہی لطیفہ سہی"

بیگم نے شیروانی کی جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا "لطیفہ نہیں سچ مچ پیغام دیجئے نا۔ کسی بے چارے شریف آدمی سے اس قسم کا مذاق کرنے سے کیا فائدہ ؟"

ہم نے کہا "سچ مچ پیغام تو خیر میں نے آپ کے یہاں بھی نہیں دیا تھا۔ مگر یہ تو دلچسپ مذاق رہے گا۔ میں اپنی تصویر بھی بھیجوں گا"

بیگم نے کہا "اور لڑکی کی تصویر خود منگاؤں گا، یہ بھی تو کہئے"

ہم نے ہنس کر کہا "اچھا یاد آگیا اپنا قصہ بے شک۔ منگاؤں گا لڑکی کی تصویر"

بیگم نے سنجیدگی سے کہا "بڑی بری بات ہے۔ انسان اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھے"

ہم نے کہا۔ "جی لاحول ولا قوۃ یہ سب اعتبارات ہیں اگر میں نے

تصویر منگالی، اور تصویر آ بھی گئی میرے پاس تو اس سے واقعی کیا اثر پڑ سکتا ہے، لڑکی یا اس کی خاندانی شرافت پر"

بیگم نے کہا "لڑکی پر تو اثر نہیں پڑتا۔ مگر انسان کو خود اپنی شرافت کا خیال تو کرنا چاہیئے"

ہم نے کہا "اور فرض کر لیجیئے کہ میں شریف نہیں ہوں تو"؟

بیگم نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "تو پھر کچھ بھی نہیں، جو چاہے کیجیئے"

ہم نے ایک پھول دار کاغذ پر "ع معرفت روزنامہ منیجر خیبر لاہور" کے نام نہایت عبارت آرائی اور خوش خطی کے ساتھ اپنی پوری قابلیت صرف کر کے ایک ایسا خط لکھا۔ کہ اس خط کو پڑھ کر بڑے سے بڑا لڑکی والا بھی تا اطلاع ثانی ہم کو غلامی میں لینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہم میں سوائے اس ایک عیب کے کہ بدقسمتی سے شادی ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں صاحب اولاد تک ہونے کے گنہگار ہو چکے ہیں اور کوئی ایسی خرابی نہیں ہے کہ کسی کو اپنی لڑکی دینے میں تامل ہو۔ لیکن اگر کسی کے سامنے ہم اپنی اس خامی کو چھپا کر بیٹھ ہوں تو اس کو آپ خودستائی نہ کہیں، بلکہ واقعہ یہی ہے۔ کہ بہت سے امیدواروں سے بہتر نکلیں گے۔ خدا نے خاندانی طور پر شریف بنا ہی دیا ہے۔ تعلیم بھی آپ کی دعا سے ہو ہی چکی ہے۔ برسر روزگار تو ہیں ہی۔ لیکن اگر نہ بھی ہوتے، تو دال روٹی کھانے کے لئے گھر میں خدا کے فضل سے کوئی کمی نہیں ہے۔ رہ گئی صورت وہ بھی کم سے کم ایسی ہے کہ تصویر ہمیشہ اچھی آ جاتی ہے۔ اور ہم خود اپنی ہر تصویر کو دیکھ کر حیران

رہ جاتے ہیں۔ کہ یہ کیا ہماری تصویر ہے؟ اب آپ ہی بتائیے کہ اس زمانے میں جبکہ بقول لڑکی والوں کے لڑکوں کا کال پڑا ہوا ہے۔ ایسے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔ اور اگر ہم میں یہ خصوصیات نہ ہوتیں تو ظاہر ہے کہ جو شادی ہو چکی ہے وہی نہ ہو سکتی۔ لیکن اس شادی کے ہو جانے کے بعد کم سے کم یہ تو طے ہو گیا، کہ ہماری شادی ہو سکتی ہے اور ہم اس قابل ضرور ہیں کہ لڑکی والے اپنی نظر انتخاب کا مرکز ہم کو بنائیں۔ ہماری طرف تو یہ حقائق ہیں، اور بیگم غالباً اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے ہمارے ساتھ شادی کر کے گویا ہماری پرورش کی ہے۔ ورنہ کہاں ہم اور کہاں شادی، یعنی اگر وہ شادی کرنے کے لئے از راہ کرم آمادہ نہ ہو جاتیں۔ تو ہم جیسے کنوارے ہی تو رہ جاتے۔ بیگم کے اس مغالطہ کو دور کرنا بحیثیت ایک خود دار شوہر کے ہمارا اولیں فرض تھا، اور اس فرض کی ادائیگی کا بہترین موقعہ یہی تھا کہ اس اشتہار سے ہم فائدہ اٹھاتے، چنانچہ ہم نے خط لکھا۔ اور بیگم کو مُنہ کر بند کر دیا۔ حالانکہ وہ اب بھی اسی طرح ہنس رہی تھیں، کہ گویا ہماری شادی ہو ہی نہیں سکتی، خیر شادی تو ہم کو بھی کرنا نہ تھی۔ مگر شادی ہو سکتی ہے یا نہیں یہ بات ضرور ظاہر کرنا چاہتے تھے خط بھیجنے کے بعد، ایک روز اسی کا چرچا رہا، اور اسی خط کے سلسلہ میں معاصرانہ نوک جھونک کا سلسلہ ہم دونوں میں جاری رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تذکرہ کچھ ختم سا ہو چلا۔ ایک دن ڈاک میں ہم کو اس خط کا جواب معہ فوٹو کے وصول ہو گیا۔ یقین جانیے

کہ ہم اچھل پڑے کیا کسی امیدوار کو ایسی خوشی ہوتی ہوگی، جو ہم کو اس وقت ہوئی تھی بیگم کی شکست کا کھلا ہوا اعتراف ان کے پندار باطل کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دینے والا پتھر اس وقت ہمارے قبضہ میں تھا۔ ہم بچوں کی طرح اچھلتے کودتے بیگم کے پاس پہونچے۔ اور ان کے ہاتھ سے کروشیا اور میز پوش دونوں کو چھین کر ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا:۔

"یہ آگیا جواب، کہئے اب آپ کیا کہتی ہیں"؟

"بیگم نے لفافے کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا "دیکھوں"

"ہم نے لفافے کو مضبوط گرفت میں لے کر کہا" ابھی نہیں، پہلے ایک مرتبہ ذرا یہ کہہ دیجئے، کہ میں نے آپ کی چوکھٹ پر ناک رگڑی تھی جوتیاں توڑی تھیں دوڑتے دوڑتے"

بیگم نے ڈھٹائی سے کہا" یہ تو میں اب بھی کہتی ہوں اور نہیں تو کیا میں خود ہاتھ جوڑتی ہوئی آگئی تھی"

ہم نے سرخروئی کے ساتھ لفافہ سے خط نکالتے ہوئے کہا" اچھا تو اب سنئے"۔

بیگم نے ہاتھ بڑھا کر کہا" یہ تصویر تو دیکھوں"

ہم نے ذرا ہٹتے ہوئے کہا" نہیں، پہلے خط سنئے فرماتے ہیں ہمارے۔ — لاحول ولاقوۃ — یعنی لڑکی کے والد صاحب محترم کہ — جناب، محترم اشتہار کے سلسلہ میں جناب والا کا گرامی نامہ مع تصویر کے موصول ہوا۔ اس اشتہار کو دیکھ کر بہت سے حضرات نے خطوط بھیجے ہیں۔ مگر میں سب سے پہلے آپ ہی کو جواب دے رہا ہوں ———"

ہم نے خط پڑھنا ملتوی کرتے ہوئے کہا "سن رہی ہیں آپ سب سے پہلے۔ اور سب خطوط کو بیکار سمجھ کر"

بیگم نے کہا "اچھا اچھا، خوش بعد میں ہو لیجئے، خط تو پڑھ دیجئے"

ہم نے پھر خط پڑھنا شروع کیا۔ آپ کا خط رسمی تکلفات اور غیر متعلق باتوں سے بالکل پاک ہے اور جو حالات آپ نے لکھے ہیں وہ میرے لئے اطمینان بخش ہیں۔ لڑکی کی تصویر بھیج رہا ہوں۔ اور میرے یہاں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے کہ میرے یہاں پردہ کی بھی پابندی نہیں ہے۔ غالباً آپ بھی اتنے ہی آزاد خیال ہوں گے اور یہی اندازہ کرنے کے لئے آپ نے تصویر طلب کی ہے۔ اب آپ مجھ کو موقع دیں، اور میں آپ کو موقع دیتا ہوں۔ کہ اپنے اپنے ذرائع سے ایک دوسرے کے لئے تحقیقات کرلیں۔ میرا شجرہ نسب منسلک ہے آپ بھی اپنا شجرہ ارسال کر دیں۔ اور تفصیلی حالات لکھیں۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے" والسلام

راقم عبدالحمید

بیگم نے خط سن کر بے صبری کے ساتھ کہا "اچھا دیکھوں تو تصویر"

ہم نے کہا "تصویر تو دیکھئے گا۔ مگر خط سنا آپ نے"

بیگم نے کہا۔ جی ہاں! یہ سنا ہے کہ تحقیقات ہو گی۔

ہم نے کہا "تحقیقات تو جب ہو گی، کہ میں خط کا جواب بھی دوں اور اگر تحقیقات ہوئی بھی تو کیا میں جولاہا ثابت ہو جاؤں گا۔ یا میراثی نکلوں گا؟ یہی نا کہ شادی شدہ ہوں، یہی بات ان کو معلوم ہو جائے گی"

بیگم نے کہا "اچھا خیر، تصویر تو دکھائیے"

ہم نے لفافہ سے تصویر نکالتے ہوئے کہا "اگر تصویر صحیح ہے تو لڑکی بری نہیں"

بیگم نے تصویر دیکھ کر کہا "ارے ——"

ہم نے کہا "کیا ہے"

بیگم نے جلدی سے کہا "کچھ نہیں یہ تو لڑکی کی تصویر ہے؟"

ہم نے تعجب سے کہا "اے سبحان اللہ۔ تو کیا آپ یہ سمجھی تھیں کہ لڑکی کے والد کی تصویر ہوگی"؟

بیگم نے کہا "نہیں! میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تو واقعی اچھی لڑکی سی ہے"

ہم نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا "لڑکی ہے ہی، لڑکی سی کیا معنی؟"

بیگم نے کہا "اچھی ہے۔ واقعی اچھی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں ناک نقشہ بھی اچھا ہے۔ بال بھی لمبے ہیں"

ہم نے تصویر پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا "اور چہرے سے ذہانت بھی برستی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی لڑکی کی تصویر ہے۔ تصویر کھینچوانا بھی ایک مستقل فن ہے اور اس فن کو یہ لڑکی جانتی ہے۔

بیگم نے تصویر پر انگلی رکھ کر کہا "یہ کیا ہے ہاتھ میں"

ہم نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "غالباً ٹینس کا بلا لئے ہوئے ہے پوری تصویر ہوتی، تو سمجھ میں آتا کہ کیا ہے"

بیگم نے کہا "ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ، یہ ٹینس کے بلے کا دستہ ہی ہے۔ اچھا تو پھر اب بھیجئے اپنے حالات لکھ کر"

ہم نے تصویر کو لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اب میں کیوں لکھوں کچھ مجھے تو بس یہ بتانا تھا، کہ میں بھی ایسا گیا گذرا، اور ایسا گرا پڑا تو نہیں ہوں، کہ مجھ کو کوئی پوچھے ہی نہیں۔"

بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔" یہ بری بات ہے وہ بے چارے جواب کا انتظار کریں گے۔ اور آپ ہیں کہ مذاق کر کے بیٹھ رہے وہ غریب اور بھی سلسلہ جنبانی نہ کر سکیں گے۔"

ہم نے کہا "کمال کرتی ہیں آپ بھی، تو کیا میں ان کو یہ لکھدوں کہ میں نے مذاق کیا تھا"؟

بیگم نے غور کرتے ہوئے اور خدا جانے کس خیال میں کھو جانے کے بعد کہا۔" ہاں تو آپ کیا لکھئے گا ان کو"؟

ہم نے لاپروائی سے کہا۔ کچھ بھی نہیں، بس چپ"

بیگم پھر کچھ کھو سی گئیں اور چند منٹ تک خاموش رہنے کے بعد بولیں۔ آپ یہ لکھ دیجئے۔ کہ اس عرصہ میں میں نے ایک دوسری جگہ سے خط و کتابت شروع کر دی ہے۔ تاکہ وہ بیچارہ آپ کے بھروسے پر بیٹھا تو نہ رہے۔"

ہم کو بھی یہ تجویز معقول نظر آئی اور یہی طے کرنے کے بعد ہم دفتر کے کمرے میں چلے آئے۔ مگر واقعہ تو یہ ہے کہ اس وقت دل و دماغ پر یہ تصویر جیسے کچھ چھائی سی جاتی تھی، اس لڑکی کے میز پر بیٹھنے کا طریقہ اور تصویر کھچواتے ہوئے کیمرہ کی طرف ایک سرسری سی نظر۔ پھر اس کی شاعرانہ نگاہیں اور شاعرگر شکل و صورت ہلکا سا تبسم، اور تبسم میں متانت کی جھلک۔ بالوں کی ژولیدگی اور

اس انتشار میں بھی ایک غیر مرتب ترتیب ان تمام چیزوں کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا؟ شادی کا خیال نہ بھی سہی لیکن اس خیال کو کیونکر روکا جا سکتا تھا۔ کہ ہماری شادی کیوں ہو چکی ہے۔ بہر حال اس وقت ہم میز کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور تصویر ہمارے سامنے تھی۔ مصور نے تصویر کو کھینچا تھا۔ اور تصویر ہم کو کھینچ رہی تھی۔ شرارت نہایت تیزی کے ساتھ سنجیدگی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ اور ہم اس طرح خاموشی کے ساتھ اس کیفیت کو دماغ کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جس طرح ایک تماشائی کسی فلم کو دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر ارادی طور پر ہم نے قلم اٹھایا۔ کاغذ گھسیٹا، اور اپنے تفصیلی حالات خط کے پیرائے میں لکھنا شروع کر دیئے۔ اس وقت صرف یہی ایک بات سمجھ میں آئی تھی، کہ اگر مزید خط و کتابت کی جائے تو آخر حرج ہی کیا ہے؟

خط لکھا اور بھیج دیا۔ مگر اب شرارت سنجیدگی اختیار کر چکی تھی۔ لہذا بیگم کے تقاضوں کے باوجود ہم برابر یہی کہتے رہے کہ آج نہیں کل خط لکھ دیں۔ حالانکہ خط لکھنا کیا معنی اب تو لکھے ہوئے خط کے جواب کا ہر وقت انتظار رہتا تھا۔ تصویر اس کثرت سے دیکھی گئی تھی۔ کہ اب حفظ ہو چکی تھی، اور بغیر دیکھے ہی ہر وقت اسی کو دیکھا کرتے تھے۔ بیگم نے آج کل کی ٹال مٹول سے عاجز آ کر اپنے سامنے ہم سے خط لکھوایا۔ مگر ہم نے باہر جا کر اس خط کو چاک کر دیا۔ بیگم اس ذکر کو رفتہ رفتہ بھول گئیں۔ مگر یہاں نہایت زور شور کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اب اس حد تک اس

شرارت نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی۔ کہ عبدالحمید صاحب ہم سے انگوٹھی تک منگا کر لڑکی کو پہنا چکے تھے۔ اور ہم نے بھی اس خیال سے انگوٹھی بھیجدی تھی۔ کہ آخر اس شرارت کی کچھ قیمت ہونا چاہئے مگر انگوٹھی بھیجنے کے بعد نیا شگوفہ یہ کھلا۔ ان صاحبزادی کا نامہ بھی موصول ہوگیا۔ جو نہایت سادہ اور نہایت معصوم طرز تحریر کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ حالانکہ ہمارے لئے یہی بہت بڑی بات تھی کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی اپنے منگیتر کو خط لکھے۔ مگر وہ ایک ایسے آزاد گھرانے کی لڑکی تھی، جہاں غالباً انگوٹھی کی رسم کے بعد خط و کتابت کی اجازت اور آزادی دے دی جاتی ہے۔ بہرحال ہم نے بھی اسی سادگی کے ساتھ خط کا جواب دے دیا۔ یعنی "جناب من" کا جواب ہماری طرف سے محض ایک سطر تھا یعنی —— "تسلیم"، آپ ہی بتائیے اور ہم کیا لکھتے، مگر اب تو خطوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ ایک دو، تین ہر ہفتہ، ہفتہ میں دو بار۔ ایک دن بیچ کرکے اور پھر روزانہ اخبار کی طرح۔ بغیر اتوار کی تعطیل کے بلکہ اتوار والا سنڈے ایڈیشن کی طرح ذرا فرصت سے لکھا ہوا طویل، حالانکہ ان تمام خطوں میں وہی کالج کی باتیں، استانیوں کے جھگڑے، سہیلیوں کی خرافات کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ مگر ہمارے لئے تو یہ مصیبت تھی، کہ ان خطوں کو چھپائیں کیونکر اور خطوں کا سلسلہ بند کریں تو کیونکر، ادھر عبدالحمید صاحب کے تقاضے کہ فوراً آؤ۔ اور ہم لوگوں سے مل جاؤ۔ زمین سخت اور آسمان دور والا مضمون صادق آرہا تھا۔ ریچھ کو کمبل سمجھ کر اوڑھ لیا تھا۔ اور اب کمبل چھوڑتا نہ تھا۔ خطوں کا جواب

دینا بند کر دیا۔ مگر آنے والے خطوں کو روکنا ہمارے بس میں نہ تھا ایک مرتبہ سوچا کہ اپنے انتقال کی خبر لکھ بھیجیں۔ پھر ارادہ کیا، کسی سے عبدالحمید صاحب کو یہ لکھوا دیں کہ لڑکا نہایت نالائق اور آوارہ گرد ہے عنقریب گرفتار ہونے والا ہے کبھی ضمیر نے ملامت کی تو تمام سچ حالات لکھ بھیجنے کا ارادہ کیا۔ مگر نہ یہ لکھا نہ وہ، اور خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا' ہر دو تین خط کے بعد ایک مختصر سا خط ہم لکھ دیتے تھے، اور اس کے جواب میں چھ چھ سات سات صفحات کے متعدد خطوط ادھر سے آجاتے تھے۔ عجیب مصیبت میں جان تھی۔ بیگم بے چاری کو کیا خبر، کہ ان کے سعادت آشنا شوہر صاحب کیا گل کھلا رہے ہیں۔ مگر اس خیال سے دم ہی نکلا جاتا تھا کہ جب ان کو خبر ہوگی اس وقت کیا ہوگا؟ ایک آدھ مرتبہ تو یہ بھی ارادہ کیا " کہ لاؤ بیگم ہی سے تمام واقعہ کہہ دیں۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ ایک بے وقوف شوہر جب خود داری کی حماقت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو وہ پھانسی تک کو قبول کر سکتا ہے۔ مگر اپنی ذاتی اور نجی بیوی کے سامنے منفعل ہو کر گردن جھکانے کو کبھی تیار نہیں ہو سکتا حالانکہ ہم ایسے بے وقوف نہیں ہیں۔ مگر خدا جانے کیوں یہ حماقت ہم پر بھی سوار تھی اور اسی رازداری میں بات کا بتنگڑ بنتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طوفان تھا، جو ہم کو حباب کی طرح ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا اور عقل حیران تھی کہ آخر اس طوفان سے ہم نکلیں گے کیونکر ـــــ شادی کرنے کا خیال تک نہ تھا، مگر جو مذاق سنجیدگی اختیار کرے، اس کو پھر مذاق کیونکر بنایا

جا سکتا ہے ـــــ ! مگر آپ جانتے ہیں، کہ وہ بڑا کارساز ہے۔ اور بڑا مسبب الاسباب
ایک روز دیکھتے ہیں، کہ پوسٹ مین صاحب نے لاکر دو لفافے دیئے۔ ایک
ہمارے نام اور ایک ہمارے "گھر میں سے" کے نام ایک ہی قسم کے دونوں
لفافے۔ ایک ہی خط میں دونوں لکھے ہوئے ہمارا لفافہ تو خیر ہماری منگیتر کا تھا۔
مگر بیگم کے نام جو خط تھا وہ بھی یقیناً اس شخص، جگہ، یا چیز کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔
جس نے ہمارے نام کے لفافہ پر لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شک کے بعد پرائے
خطوط کو کھولنا مجرمانہ طور پر جائز ہو جاتا ہے۔ لہذا ہم نے نہایت احتیاط کے
ساتھ پانی لگا کر لفافہ کھولا، اور اب جو اسے پڑھتے ہیں تو ـــــ

رات گزری نور کا تڑکا ہوا

ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

ان ہی صاحبزادی کا خط۔ بخدا ان ہی مسماۃ کا والا نامہ تھا اور ستم یہ کہ
معلوم ہوا کہ عرصہ سے خط و کتابت جاری تھی، ملاحظہ ہو ذرا یہ خط:۔

پیاری سعیدہ۔ تمھارے خط کے ساتھ ہی ابا جان کے اور میرے
نام تمھارے شوہر نامدار کے خطوط بھی آئے، وہ حضرت اب تک
ابا جان کو مغالطہ میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ میں ابا جان سے کسی نہ کسی
طرح کہلوا دیتی، مگر تمھاری اجازت کے بغیر اس سلسلہ کو کیسے ختم
کر سکتی ہوں؟ مگر خدا کے لئے میری تصویر ان حضرت کے قبضہ سے
نکال لو۔ اب کے میرے نام ان کا جو خط آیا ہے۔ وہ بھیج رہی ہوں
اس کا جواب فوراً لکھ کر بھیجدو۔ فی الحال تو میں خط کی محض رسید

دے رہی ہوں ، اچھا یہ بتاؤ کہ یہ تماشہ ختم کب کرو گی ؟ امی جان دعا
کہتی ہیں ۔

تمھاری بہن

رضیہ

اب معلوم ہوا کہ تصویر دیکھ کر بیگم صاحبہ کا بے ساختگی کے ساتھ "ارے"
کہنا کیا معنی رکھتا تھا اور اب پتہ چلا ، کہ شرارت محض سنجیدگی ہی نہیں بلکہ حادثہ
بھی ہو سکتی ہے ۔ خیر یہ تو سب کچھ ہوا مگر یہ تو بتائیے کہ اب ہم گھر میں کیونکر جائیں
؟ ـــــ

نانی فطو

نانی فطّو کی عمر کا اندازہ کسی اور کو کیا ہوتا جبکہ خود وہ کچھ اس طرح حساب لگایا کرتی تھیں کہ بس یہ سمجھ لو کہ غدر میں بارہ برس کی تھی۔ اور منگنی میری ہو چکی تھی اللہ بخشے تمہارے نانا کو جو اسی غدر میں مارے گئے اس پر ہم لوگ جرح کرتے کہ نانی جب وہ بے چارے منگنی کے بعد اور نکاح سے پہلے ہی مر گئے تو نانا کیسے ہو گئے وہ ہمارے "

اس پر وہ کچھ غور کرنے کے بعد اپنے پوپلے منہ سے مسکراتے ہوئے کہتیں کہ ــــــ اے ہاں سچ تو ہے عقل پہ پتھر پڑیں میری۔ نانا تو تمہارے وہ ہوئے نا جن سے بعد میں میری شادی کر دی گئی۔ وہ بے چارہ میرا ٹھیکرے کا منگیتر تو ناشادہی مار دیا گیا تھا۔ ہائے کیا گبرو جوان تھا۔ وہ میدے اور شہاب سا رنگ۔ گال جیسے کابلی سیب رکھے ہوں۔ بادام جیسی آنکھیں "

اور ہم میں سے کوئی نہ کوئی چھیڑتا نانی کو ــــــ " عشق تھا۔ شاید نانی آپ کو ہمارے نہ ہو سکنے والے نانا سے "

اور وہ اس عمر میں بھی شرماتے ہوئے کہتیں " چل دور۔ ہمارے زمانے میں

یہ موا عشق وشق نہیں ہوتا تھا یہ ہوا تو اسی زمانے میں چلتی نظر آتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرنے والے کو اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔"

پھر ان سے سوال ہوتا ...... اور نانی ہمارے اصل نانا کے متعلق کیا رائے ہے۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے کہتیں ..... اے وہ بھی آدمی کا بچہ تھے دوسرے یہ کہ مرد ذات کی صورت ہی کیا۔ البتہ اگر رنگ پکا نہ ہوتا تو وہ بھی ناک نقشے کے ہزار دو ہزار میں ایک تھے۔ اگر نوج بیوی ایسا مزاج ہو کسی کا غصہ جیسے ناک پر رکھا رہتا تھا۔ اللہ ان کی روح کو نہ شرمائے۔ زندگی بھر مجھ کو میرے اسی منگیتر کے طعنے دیتے رہے اور خود حال یہ تھا۔ کہ وہی مثل کہ سے

آج یہ جان ہیں تو کل وہ جان

آپ کی جان سب پہ قربان

نانی بغیر کوئی شعر پڑھے اتنی بات کر گئیں اسی پر تعجب ہے ورنہ وہاں تو بات پیچھے ایک پھڑکتا ہوا شعر لے لیجئے ان کے انداز بیان کے تو ہم لوگ فریفتہ تھے۔ چنانچہ ہر دوسرے تیسرے یہی ہوتا۔ کہ رات کو کھانا کھا کر سونے سے پہلے سب کے سب نانی کو گھیر کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور وہ سنانا شروع کر دیتی تھیں دنیا جہان کے قصے جن میں ان کی زبان کی مٹھاس اور انداز بیان کی شیرینی سب ہی کچھ ہوتی تھی۔ البتہ بقول بھائی جان کے وہ صرف ضعیف ہی نہ تھیں۔ بلکہ روای ضعیف بھی تھیں۔ اور اکثر تو ایسی بے پرکی اڑاتی تھیں کہ اس بات کا یقین ہو جاتا تھا۔ کہ شاید انھیں خدا کو منہ دکھانا ہی نہیں ہے۔ مثلاً ایک

دن کہنے لگیں کہ :-

اللہ بخشے تمہارے نانا جب بنگال کے سفر کو جانے لگے۔ تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ خدا ہی ہے جو وہاں کی جادوگرنیوں سے بچ کر یہ آجائیں۔ وہ ٹھہریں آدمی کو مکھی بنا دینے والیاں اور یہ ایسے دل پھینک کہ مکھی بن کر بھی ان ہی پر بھنبھناتے رہیں ان سے تو میری بوٹی بوٹی کانپتی تھی ان کے غصے سے۔ نتیجہ یہ کہ گئے اور وہاں سے ایک بلا اپنے سر لگا لائے۔ اور ڈھٹائی تو دیکھو اس بنگالن کو لا کر مجھ سے کہنے لگے۔ کہ اس کو سوت نہ سمجھنا سہیلی ہے۔ میل ملاپ سے رہو گی تو عیش کرو گی نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ اے بیٹا اب جو میں نے اس بنگالن کے لچھن دیکھے تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے۔ کہ رات کو پلنگ پر اپنے کمرے میں لیٹی ہے کہ تمہارے نانا نے باہر سے کنجی جو کھٹکھٹائی تو اس نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر سترہ گز کی انگنائی پار کی ـــــ اور دروازے کی کنڈی کھول دی۔ وہ تربوز لے کر آئے ایک اسے دے دیا اور ایک مجھے، میں نے تو اپنا تربوز چاقو سے کاٹ کر لگن میں قتلے بنائے اور رکھ لیا۔ اور اس نے چھپکے پر ٹانگ دیا تربوز۔ دوسرے دن جو میں نے پوچھا کہ اے چھوٹی بیگم کھایا نہیں تربوز۔ تو بولی کہ کب کا کھا چکی۔ اور میں ہکا بکا کہ یہ ہوا نہ کاٹا گیا نہ ٹانکی لگی آخر کھایا کیسے گیا۔ تو اس نے چھینکے سے اتار کر وہ تربوز مجھ کو کاٹ کر دکھا دیا کہ اندر سے کوداصاف ہے۔ دن رات بس ایسی جان لیوا تماشے دیکھا کرتی اور اپنی جان کو ڈرتی کہ کسی نہ کسی دن یہ ڈائن مجھ کو بھی اسی تربوز کی طرح کھا پی کر چھٹی کرے گی۔

بیٹا ایک دن جو وہ کوٹھے پر دھوپ میں نہانے گئی تو نہ آج اس کا نہان ختم

ہوتا ہے ۔ نہ کل میں نے دبے پاؤں اوپر جاکر دروازے کے ایک سوراخ سے جھانک کر
جو دیکھا تو میرا دم ہی نکل گیا ۔ وہ اپنی تمام انتڑیاں لگن میں رکھ کر صابن سے
مل مل کر دھو رہی تھی ۔ پھر اس نے زبان جو منہ سے گھسیٹی تو وہ کئی گز کھنچتی چلی
آئی اور وہ اس شیطان کی آنت کو لگی دھونے ۔

میں تو بھاگی وہاں سے سر پر پیر رکھ کر اور تمھارے نانا سے آکر میں نے کہا
کہ وہ سنتے ہو ذرا اوپر دروازے کے سوراخ سے اپنی رانی کا غسل دیکھ لو " وہ
جو گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ موئی اپنی دونوں آنکھیں ہتھیلی پر نکالے ان کو
صابن سے دھو رہی ہے ۔ اور لگن میں وہ پیٹ کی ساری انتڑیاں ڈھیر ہیں ۔
اس دن ان کو یقین آیا ۔ کس ڈائن کے پلے بندھے ہیں ۔ آخر میں نے ملّاجی کو
بلوا کر عمل جو پڑھوایا تو پہلے تو اس نے بڑا اُدھم مچایا ۔ بڑی اچھلی کودی مگر آخر ملّاجی
بھی بڑے پہنچے ہوئے تھے ۔ ایک مرتبہ پڑھ کر جو دم کرتے ہیں تو چکرا کر گری چاروں
شانے چت اور بس دھواں بن کر اڑ گئی ۔ اور میرا یہ حال کہ ۔ ع

"کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"

اب اگر ان کی روایتوں پر کوئی ہنس دے یا بحث کرنے بیٹھ جاتے تو وہ اپنی
اور اس کی جان ایک کر دیں ہزاروں قسمیں کھائیں گی ۔ اپنے قبر میں پیر لٹکائے
ہونے کا حوالہ دیں گی ۔ اور مع جوتیوں کے آنکھوں میں گھس کر ضد کریں گی
کہ ان باتوں کو سچ سمجھ لیا جائے ۔ اب بتائیے کہ ان حالات میں ان کی کسی
روایت پر یقین آئے تو کیسے آئے ۔ وہ ہزاروں جھوٹ سچ بنا کر بولا کرتی تھیں ۔
لہذا ان کے ہزاروں سچ جھوٹ بن کر رہ جاتے تھے ۔ جب وہ غدر کی کہانیاں آپ بیتی

بیان کرتی تھیں۔ تو جی چاہتا تھا کہ وہ یہ حالات سچے سچے سنا دیں مگر یہ اصرار تو اس سے ہو جو یہ تسلیم کرنے کو تیار ہو کہ ہاں مجھ کو جھوٹ بولنا بھی آتا ہے چنانچہ اب یہ تو خدا ہی جانے یا نانی کہ وہ غدر میں تھیں بھی یا نہیں۔ اور جو کچھ وہ بیان کرتی ہیں وہ ان پر گزری بھی ہے یا نہیں۔ مگر جب یہ ذکر چھڑ جائے تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہی تھیں کہ:۔

بیٹا خدا وہ دن کسی کو نہ دکھائے اور جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ اب خدا سامنے نہ لائے۔ مجھے تو وہ وقت بھولتا نہیں ہے کہ تمھارے نانا اللہ بخشے گھبرائے ہوئے گھر میں آئے اور کہنے لگے کہ روپے پیسے۔ زیور سب ایک پوٹلی میں باندھ لو اور راتوں رات نکل کھڑی ہو جدھر خدا لے جائے نہیں تو صبح تک نہ کسی کی جان کی خیر ہے نہ آبرو کی اے بیٹا چھکے چھوٹ گئے۔ سب کے یہ سن کر جلدی جلدی جو کچھ ہاتھ آیا سمیٹا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم چار عورتیں اور تین مرد۔ کل سات تھے۔ دھڑا دھڑ گولیاں چل رہی تھیں۔ جیسے چنے بھونے جا رہے ہوں۔ یہ موئے گورے تلنگے شراب کے نشے میں دھت مولی گاجر کی طرح کاٹتے پھر رہے تھے سب کو۔ وہ لٹس مچی ہوئی تھی کہ خدا کی پناہ۔ اس پر طرہ یہ کہ آگ لگے میری اس جوانی کو صورت شکل کی تو تھی ہی بالکل بنی بنائی میم کہیں نظر پڑ گئی کسی گورے کی مجھ نامراد پر او رہو گیا مو الٹو۔

سنو تو موئے کی عیاری کہنے لگا یہ کوئی اصل نسل کی میم ہے جس کو تم لوگ بھگائے لئے جا رہے ہو۔ میرے نانا نے کچھ کہا تو سنگین اتار دی اس موئے نے ان کے سینے میں اور وہ وہیں تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے پھر میرے ابا میاں

آگے بڑھے اور ہم لوگوں سے کہا کہ بھاگو ہم ادھر بھاگے اُدھر اس موئے نے ٹھائیں سے گولی ان پر بھی داغ دی۔ مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ وہی میرا منگیتر اس سے گتھ گیا۔ اور ہم بھاگم بھاگ بڑے امام باڑے تک پہونچ کر ایک اندھیری کوٹھری میں دم سادھ کر کھڑے ہو گئے۔ اے بیٹا ساری رات اسی طرح کھڑے رہے تو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ پو پھٹتے ہی پکڑے جائیں گے اور جائیں تو جائیں کہاں۔ ؟ من من بھر کا ایک ایک پاؤں ہو رہا تھا۔ کبھی گھر سے نکلے ہوتے تو ایک بات بھی تھی زندگی میں یہ نگوڑ ماری پہلی بھگدڑ دیکھی تھی نہ یہ پتہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے۔ نہ یہ خبر کہ کس طرف بچ جائیں گے۔ آخر آدھی رات گذری ادھر اور اُدھر ہم چاروں عورتیں اللہ کا نام لے کر نکل کھڑی ہوئیں درختوں کی آڑ لیتے جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے جدھر منہ اٹھ گیا چلتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس خیال سے بھی خون خشک تھا کہ اگر کسی موئے لیٹرے نے پکڑ لیا تو روپیہ پیسہ زیور کی جو پوٹلی ہے وہ بھی چھینی جائے گی اور اسی کی وجہ سے جان گنوانا پڑے گی۔ اللہ بخشے خالہ جان نے ایک سنسان سی جگہ پہونچ کر کہا کہ خدا کے لئے اس پوٹلی کو کہیں زمین کو کھود کر دبا دو اچھے دن آئے تو پھر آکر نکال لے جائیں گے۔ نہیں تو اس کے ساتھ ہی جانوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اماں جان کو انھوں نے وہ پوٹلی نکال کر خالہ جان کو دے دی اور ہم سب نے ایک ٹوٹی ہوئی قبر کی دو تین اینٹیں سرکا کر وہ پوٹلی اس میں دبا دی۔ اور اس جگہ کو اچھی طرح پہچان کر پھر

چل کھڑے ہوئے۔ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ قدم رکھتے کہیں تھے پڑتے کہیں تھے۔ مگر جان ایسی پیاری تھی کہ چلے ہی جا رہے تھے۔ نہ یہ ہوش تھا کہ مرنے والوں پر دو آنسو ہی بہالیں نہ یہ انتظار کہ جس کڑیل جوان کو اس موئے گورے سے لڑتا ہوا چھوڑ آئے تھے شاید وہ آتا ہی ہو۔ یہاں تو ہمیں اپنی ہی پڑی تھی۔

نور کے تڑکے ایک گاؤں کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ایک دیہاتی نے کڑک کر پوچھا کہ "کون ہو تم" اور ہم سب نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا کہ لو بھئی آئی ملک الموت کی سواری۔ مگر خدا بھلا کرے اس دیہاتی کا وہ تھا شریف آدمی۔ ہماری بپتا سن کر کہنے لگا کہ تمھارا اس طرح مارے مارے پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم میرے گھر چلو جو روکھی سوکھی میں کھاؤں گا وہی تم بھی کھالینا اور اگر تم پر کوئی آفت آئی تو میری لاش کو روند کر تم تک پہونچ سکے گی"۔

نانی جان نے دم لینے کے لئے اپنا پاندان سرکایا چھالیا کاتھا کو والا پان بنا کر پن کٹی میں کوٹا اور چمچے سے اس پان کا معجون کھا کر پھر تازہ دم ہو کر بولیں:۔

میں تو یہ کہتی ہوں بیٹا کہ وہ کوئی فرشتہ تھا یا شاید خواجہ خضر ہی ہوں اپنے گھر لے جا کر اس نے ایک کوٹھری جیسا کمرہ ہم چاروں کو دے دیا۔ اب جو ہم وہاں اطمینان سے بیٹھے تو مرنے والوں کی یاد نے ستایا۔ اماں نے سہاگ کی چوڑیاں توڑیں نانی اماں نے بقچی سے سفید ڈوپٹہ نکال کر اوڑھا۔

خانہ جان اپنے کڑیل جوان بیٹے کے لئے سرپیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ کہ ہائے مجھ اندھی کی وہی تو لاٹھی تھی۔ اور میں تھی کہ رو بھی رہی تھی اور چوڑ بھی بنی

ہوئی تھی کہ یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہوا۔ ہم سب کا یہ رونا پیٹنا سن کر وہ بے چارہ دیہاتی آ گیا۔ دیر تک ہم سب کو سمجھاتا بجھاتا رہا پھر اس نے زبردستی کر کے ہم کو موٹی موٹی روٹیاں اور چنے کا ساگ کھلایا اسی سے معلوم ہوا کہ ہم لکھنؤ اور سیتا پور کے بیچوں بیچ ایک گاؤں میں ہیں۔ اور اس نے ہر طرح سے ہم کو تسلی دی۔ کہ یہاں کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ ان گوروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ شہر کی دولت لوٹنا چھوڑ کر اس گاؤں کے غریبوں پر حملہ کریں۔ دوسرے اس گاؤں پر اگر آفت آئی بھی تو جب تک گاؤں کا ایک ایک مرد ختم نہ ہو جائے ہم لوگوں پر آنچ نہ آئے گی۔ اے میاں اس نے اور اس کے یہاں کی عورتوں اور بچوں نے ہم لوگوں کی وہ خدمت کی ہے کہ دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔ مگر بدقسمتی نے اب تک ہمارا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

ایک رات جب سب پڑے سو رہے تھے اس گاؤں میں بھی گولیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ اور پھر وہی بھگدڑ شروع ہو گئی۔ میاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان موئے گوروں کو کہ یہ ہنستے ہنستے پھول جیسے بچوں کو سنگینوں سے چھید کر اٹھا لیتے تھے۔ گولیاں جھونکتے پھرتے تھے۔ میں نے بچوں کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر چیرتے ان کو دیکھا۔ ہم چاروں کو اس دیہاتی نے ایک کوٹھری میں جس میں بھینسوں کا بھوسا بھرا ہوا تھا چھپا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسی بھوسے میں خود اس کی بیوی اور بیٹی بھی چھپی ہوئی تھی۔

صبح جب موئے لیٹرے چلے گئے تو معلوم ہوا کہ اس بے چارے دیہاتی کو بھی درخت سے لٹکا کر پھانسی دے گئے ہیں۔ درختوں سے لاشیں اس طرح

لٹک رہی تھیں جیسے یہ لاشوں ہی کے درخت ہوں ۔

اے میاں اب ہم پھر وہاں سے بھاگے اس لئے کہ ہم نے یہاں بھی سنا تھا کہ ان گوروں کا خیال تھا کہ کوئی میم یہاں بھگا کر لائی گئی ہے ۔ اور اس کو ان گاؤں والوں نے چھپا لیا ہے ۔ میرا ماتھا فوراً ٹھنکا کہ میرے متعلق کہا جا رہا ہے ۔ اور ہو نہ ہو یہ وہی مردار گورا مجھ کو ڈھونڈھتا اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں تک پہونچا ہے جو مجھ کو لکھنؤ ہی میں لے اڑنا چاہتا تھا ۔

میں نے اماں جان سے کہا کہ جس طرح بھی ہو یہاں سے نکل بھاگو نہیں تو یہ ہمارے خون کے پیاسے پھر یہاں آئیں گے اور ایسا نہ ہو کہ مجھ کو ڈھونڈھ نکالیں ۔"

ہم میں سے ایک نے کہا ۔" تو نانی آپ اپنے اس عاشق گورے کو پہچان تو گئی ہوں گی ۔"

نانی نے تیوری بدل کر کہا ۔" اے جھاڑو پھرے اس موئے کی صورت پر ۔ عاشق ہو وہ اپنے ہوتوں سوتوں کا ۔ لو بھلا میں کیا پہچانتی اس کو سب ہی گورے ایک ہی صورت کے ہوتے ہیں ۔ جیسے سب بندر ایک شکل کے ہوتے ہیں ۔ تو بھیا پھر راتوں ہی کو ہم چاروں بھاگ کھڑے ہوئے ۔ رات بھر چلتے تھے اور دن بھر کسی نالے میں کسی کھنڈر میں کسی جھاڑی واڑی میں دبکے بیٹھے رہتے تھے ۔ خدا خدا کر کے تین راتیں چلنے کے بعد برے حالوں گرتے پڑتے سیتا پور پہونچ گئے ۔ یہاں نانی اماں کے ایک دور کے رشتہ دار رہتے تھے ۔ پوچھتے گچھتے ان کے گھر پہونچے وہ بے چارے ہمارا یہ حال دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے ۔ اور ہم کو رلاتے تھے ۔ آخر وہی بے چارے ہم کو سمیٹ کر بیٹھ گئے ۔

اماں جان نے سلائی کی مزدوری شروع کر دی۔ نانی اماں بچوں کو قرآن شریف پڑھانے لگیں۔ خالہ جان ایک نواب صاحب کے محل میں مغلانی بن گئیں اور میں نے مُرّی پھندے کی کڑھائی کا کام شروع کر دیا۔ نانی اماں کے یہ رشتہ دار جن کو ہم سب مرزا صاحب کہتے تھے۔ آخر ایک دن مچل گئے میرے لئے کہ میں تو اسی کو اپنی بہو بناؤں گا۔ تو بیٹا قسمت میں یہی جوڑا لکھا تھا۔ لہذا شادی ہوگئی۔ ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ "اور نانی وہ خزانہ یعنی آپ کا روپیہ اور زیور جو ٹوٹی قبر میں، ڈال دیا تھا؟"

نانی نے کہا۔ "توبہ کرو۔ لاکھ ڈھونڈھا۔ چپہ چپہ چھان مارا مگر کچھ نہ ملا۔ ایک ایک قبر جھانکی۔ تمھارے نانا اللہ بخشے مدتوں ڈھونڈھتے رہے۔ مگر کچھ نہ ملا۔"

اب کون نانی سے پوچھے۔ اس قصّے میں کتنا سچ ہے اور کتنا حاشیہ۔ ممکن ہے کہ یہ محض حاشیہ ہی حاشیہ ہو۔

ڈاکٹر

ہندوستان میں تعلیم اور تپ دق دونوں کی ترقیاں کچھ اس طرح ساتھ ساتھ جاری ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میڈیکل کالجوں سے ہر سال ڈاکٹر زیادہ برآمد ہوتے ہیں یا ہر سال دق کے مریض قبرستانوں میں زیادہ داخل ہوتے ہیں بہرحال بظاہر تو ڈاکٹروں ہی کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دق کے مریض شہرت پسند نہیں ہوتے اور نہ اپنے سائن بورڈ پر اپنا مرض لکھتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں کے سائن بورڈ تو اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر اتنے ڈاکٹروں کو مریض کہاں سے ملتے ہوں گے اور اگر اتنے ڈاکٹروں کے تناسب سے اس ملک کے لوگ بیمار بھی ہوتے ہیں تو آخر یہ محکمہ حفظانِ صحت کس مرض کی دوا ہے۔ دراصل ڈاکٹروں کی کثرت سے صرف دو ہی نتیجے نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ اس ملک کی سو فی صدی آبادی دائم المرض ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد طبابت کے بجائے کوئی دستکاری سیکھنے پر مجبور ہوتے ہوں گے یا پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہوں گے یا کسی فلم کمپنی میں نوکری کر لیتے ہوں گے۔ اس لئے

کہ ڈاکٹروں کا تو حال ہے کہ پیسے کی دوا کا کھلا ہوا نرخ ہے۔ کسی گلی کوچے میں چلے جائیے۔ وہاں آپ کو ایک آدھ ڈاکٹر ضرور مل جائے گا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نہ سہی۔ ایل۔ ایم۔ پی۔ سہی۔ ورنہ ہومیوپیتھک والے ایچ۔ ایم۔ بی تو ضرور ہی مل جائیں گے اور یہ سب گویا ان ڈاکٹروں کے علاوہ ہوں گے۔ جو سرکاری اسپتالوں میں مفت علاج کرنے اور مفت علاج کے ساتھ ساتھ مفت دوا بھی دینے کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ اب بتائیے آخر ان سب کو مریض کہاں سے ملتے ہوں گے۔ اور ان کی ڈاکٹری کیونکر چلتی ہوگی۔ سرکاری ملازمت محدود ہے اور ڈاکٹروں کی تعداد لا محدود۔ نتیجہ یہ ہے کہ چند تو سرکاری ڈاکٹر ہو جاتے ہیں باقی سب بیوپاری ڈاکٹر بن کر پرائیوٹ پریکٹس کرتے ہیں اور بالکل تجارت کے اصول پر اپنی ڈاکٹری چلاتے ہوں گے۔ ان بیچاروں کی گھریلو زندگی کیا ہوتی ہے۔ اس کو دراصل باہر والے سمجھ ہی نہیں سکتے اور خود ہم کو بھی وہ بھی حالات قیامت تک معلوم نہ ہوتے اگر اس قسم کے ایک پرائیوٹ ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوسی نہ ہوتے۔

ہمارے یہ پڑوسی ڈاکٹر صاحب اچھے خاصے مکان میں اچھی خاصی آن بان کے ساتھ رہتے تھے۔ مطب میں فرنیچر بھی اچھا خاصا تھا اور سوٹ بھی باقاعدہ پہنتے تھے۔ موٹر گو سکنڈ ہینڈ درجہ سے گزر کر تھرڈ ہینڈ ہو چکی تھی اور اس کو بیک نظر دیکھ کر وثوق کے ساتھ کہنا دشوار تھا۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ موٹر تھی ضرور اور اگر اس میں پٹرول ڈال دیا جاتا

تھا تو چلتی بھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آواز اور رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے سائن بورڈ پر ڈاکٹری کی ڈگری کا حوالہ بھی تھا اور خود ہم نے مزید تصدیق کرنے کے لئے وہ ڈگری بھی ان کے مطلب میں آویزاں دیکھ لی تھی جس کے بعد یہ تو گویا طے ہی ہو گیا تھا کہ وہ سند یافتہ ڈاکٹر ہیں اب رہ گیا اس ڈاکٹری کا چلنا اس کو ہم نے ہمیشہ ان کی موٹر کی طرح چلتے دیکھا۔ اول تو آپ کے مطلب میں مریض ہی کم نظر آتے تھے اور جو کوئی نامراد ایک مرتبہ نظر بھی آیا تو دوسری مرتبہ اس کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس جاتی تھیں۔ اس سلسلہ میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب کا بیان یہ ہے کہ ایک ہی نسخہ میں چونکہ مریض بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ لوٹ کر نہیں آتا اور ان کی بیوی اخراجات کے سلسلہ میں مشکلات کا شکار رہتی تھیں۔ بلکہ ان کا خیال یہ تھا۔ کہ چونکہ مریض تمہارا علاج کرتے ہی مر جاتا ہے۔ لہذا اس کو دوسری مرتبہ مطلب آنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ان دو بیانات میں ایسا زبردست تضاد ہے کہ ایک غیر متعلق آدمی نہ ڈاکٹر صاحب کی تائید کر سکتا ہے نہ ان کی بیوی کی رائے سے متفق ہو سکتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب کی ظاہری شان و شوکت دیکھنے والے خواہ ان کو کچھ ہی سمجھتے ہوں مگر ہم تو روزانہ ان کے گھر کے جھگڑے سنا کرتے تھے لہذا ہم جانتے تھے کہ اس خوبصورت غلاف میں کس قدر بدصورت تصویر ہے۔ اور اس عظیم الشان ڈھول میں کیسا زبردست پول ہے قصہ دراصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی بلیہ محترمہ ذرا کھاتے پیتے گھرانے کی تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنا

سب کچھ اپنی تعلیم پر صرف کرنے کے بعد صرف ڈاکٹر بنے تھے اور اب ڈاکٹری کے بجائے اپنی بیوی کے زیورات کے رہین منت تھے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ عورت زیور کو کیا سمجھتی ہے اور کن خیالات کے ماتحت کس طرح زیور کو جدا کر سکتی ہے اور اس امتحان میں کس حد تک ثابت قدم رہ سکتی ہے۔ بہر حال واقعات کچھ ایسے تھے کہ بیوی اپنی جان سے بیزار تھیں اور ڈاکٹر صاحب مکان دار سے شرمندہ تھے جس کا کرایہ اس حد تک چڑھ چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے منہ چرانا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں تو کہلوا دیا کہ مریض دیکھنے گئے ہیں۔ راستہ میں ملاقات ہو گئی تو بس ایک گھنٹہ کا وعدہ کر کے ٹال دیا۔ اس ڈر کے مارے مطب میں بیٹھنا چھوڑ چکے تھے اور باہر نکلتے بھی تھے تو ذرا چوکنا اور مالک مکان سے نظر بھی بچائے ہوئے آخر ایک روز جب مکان دار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبی کلمات کہے تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اس دن ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ڈاکٹر کی گھریلو اور بیرونی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مکان دار کو تو خیر کسی نہ کسی طرح ٹال دیا۔ مگر بیوی نے فیصلہ کن انداز سے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔

"میں پوچھتی ہوں کہ آخر کب تک یہ بہانہ سازیاں ہوں گی اور ایک اسی پر کیا ہے۔ ہر کام میں وقت ہو رہی ہے۔ بچوں کے اسکول کی فیس بیمہ کمپنی کی قسط۔ آپ کی کتابوں کی قیمت۔ بزاز کے دام ایک بات ہو تو کہی جائے۔ میں تو ہر وقت کے تقاضوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ مگر روپیہ کی صورت کہیں

سے نظر نہیں آئی ۔

ڈاکٹر صاحب سعادت مندی کے ساتھ ہنستے رہے اور اس کے بعد نہایت پریشانی کے ساتھ کہا ۔

"آخر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں ۔ میں ڈاکٹر ہوں ڈاکٹری سند موجود ہے ۔ مطلب کرتا ہوں ۔ نبض دیکھ لیتا ہوں ۔ آپریشن کر سکتا ہوں ۔ مگر حال یہ ہے کہ مہینوں کوئی مریض ہی نہیں آتا آخر میں مریضوں کو کہاں سے لاؤں ۔ اگر کسی بازار میں مریض ملتے ہوتے تو وہیں سے لے آتا "

بیوی نے جل کر کہا " تو پھر اس ڈاکٹری کمبخت کو چھوڑ و نا ۔ آخر کب تک یونہی ایڑیاں رگڑی جائیں گی ؟"

ڈاکٹر صاحب نے معصومیت کے ساتھ کہا " ڈاکٹر ہو کر ڈاکٹری کو کیسے چھوڑ دوں ۔ آج تک کسی ڈاکٹر نے یہ بھی نہ کیا ہوگا کہ پاس کرے ڈاکٹری اور شروع کر دے ٹکٹ کلکٹری یا سب رجسٹراری "

بیوی نے کہا " پھر آخر بات کیا ہے کہ تم کو ڈاکٹری سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی ؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا " مجھ ہی پر کیا منحصر ہے اس سڑک پر چار ڈاکٹر اور تین ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر رہتے ہیں اور میں تو ان میں سے ہر ایک کے مطب میں سناٹا ہی دیکھتا ہوں قصہ دراصل یہ ہے کہ بد قسمتی سے اس شہر کی آب و ہوا اچھی ہے اور یہ بھی ہمارا مقدر کہ کوئی وبائی مرض بھی یہاں شروع نہیں ہوتا اور کچھ دنوں کے لئے ذرا ہیضہ شروع ہو گیا تھا ۔ اور خود تم اس زمانے میں بے حد خوش نظر آتی تھیں مگر یہ قسمت کی گردش ہی تو ہے کہ جب سے وہ

بیٹھ گیا۔ آج تک اس شہر میں کسی کو چھینک تک نہیں آئی۔ ورنہ میرے پاس کوئی مرا کھپا آتا۔"

بیوی نے کہا "اور جو تم سوداگر صاحب کے لڑکے کا علاج کر رہے تھے۔ ان سے تو کبھی کبھی مل ہی جاتا تھا۔"

بیوی نے کہا "اور وہ سیٹھ صاحب کی بہو بھی کیا تم نے مار ڈالی۔"

ڈاکٹر نے سر اونچا کر کے کہا "نہیں صاحب وہ کمبخت تو حیرت انگیز طریقہ پر اچھی ہو گئی۔ میں نے لاکھ لاکھ اس کو جھولانا چاہا۔ اور مرض کو ایک حالت پر قائم کر دینے کی ہر تدبیر کی۔ مگر وہ ایسی بے حیا کہ اس کو ہر وہ دوا فائدہ کرنے لگی۔ جس سے کہ نقصان ہونا چاہیئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل اچھی ہو کر چلی گئی۔ دراصل یہ تمام باتیں مقدرات سے ہوتی ہیں۔"

بیوی نے کہا "تو کیا آج کل کوئی بھی مریض نہیں ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "دو مریض ہیں۔ ایک تو بے چارہ اس قدر غریب ہے کہ علاج کے علاوہ اس کی کچھ مالی امداد بھی کرنی چاہیئے اور دوسرے صاحب کل ملے ہیں۔ ان سے ذرا امید ہے۔ سنا ہے کہ مالی حالت اچھی ہے۔ اور آنتوں کے دق میں مبتلا ہیں۔ تمام ڈاکٹروں نے آنتوں کی دق تجویز کر کے ان کو ڈرا اٹکا لیا ہے کل تو وہ خود مطب میں آئے تھے مگر میں نے ان سے کہدیا ہے کہ آپ کے لئے نقل و حرکت مضر ہے۔ لہذا امید ہے کہ وہ اب مجھ ہی کو بلائیں گے۔ اور میں ان کی اس قابلیت سے انشاءاللہ علاج کروں گا کہ۔ بیوی نے بات کاٹ کر کہا "کہ وہ جلدی سے اچھے ہو کر چلے جائیں تو یہ

سلسلہ بھی جائے "

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا "اجی لاحول ولا قوۃ" پہلی پوری بات تو سن لیا کرو۔ قابلیت سے علاج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنا معتقد بنالوں گا۔ دو نسخوں سے فائدہ ہوا تو تیسرے میں پھر ان کو اس قابل بنادوں گا کہ وہ فوراً مجھ کو بلائیں۔ پھر ذرا ان کی حالت میں سکون پیدا کردیا۔ اگر یہ سلسلہ کچھ دنوں چل گیا تو مکان کا کرایہ پورا انشاءاللہ ادا ہوجائے گا۔ اس لئے کہ مریض کی حالت ابھی ایسی ہے کہ اس کو کچھ دنوں اسی مدّوجزر میں رکھا جائے "

بیوی نے کہا "میں تو اس کمبخت ڈاکٹری کو خدا جانے کیا سمجھتی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی آمدنی میرے خیال میں ہمیشہ بہت ہی زیادہ ہوتی تھی۔ مگر میں پوچھتی ہوں کہ آخر یہ جو بہت بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں ان کو آخر مریض کہاں سے مل جاتے ہیں —— ؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا "او ہو۔ یہ تمھارے سمجھنے کی چیز نہیں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے۔ حالانکہ محض موٹر چلتی ہے ڈاکٹری بھی چلنے لگتی ہے اب اگر میں اسی طرح موٹر دوڑاؤں تو جس طرح مکان دار نے جینا دوبھر کردیا ہے اسی طرح پیٹرول والے ناطقہ بند کردیں اور موٹر روزانہ کارخانہ میں مرمت کے لئے کھڑی ہوئی نظر آئے۔ یوں جب میں اس پر نکلتا ہوں تو لوگ دو رویہ کھڑے ہوکر دیکھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟"

بیوی کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ باہر سے ڈاکٹر صاحب کو کسی نے آواز دی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے گڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا:" وہی مریض ہے جس کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا۔ ذرا اس سے کہلوا دیجئے کہ ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھنے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ آپ مطب میں بیٹھئے۔ اتنی دیر میں کپڑے پہن کر پشت کے دروازے سے نکل جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب ادھر کپڑے پہننے لگے اور ادھر ہم نے کپڑے پہننے شروع کئے کہ آج ڈاکٹر صاحب کے مطب کی سیر کریں گے اور ان کی یہ گھریلو حالت دیکھنے کے بعد ان کے مطب کی شان دیکھیں گے۔ چنانچہ جس وقت ہم پہنچے ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب مطب میں تشریف نہیں لائے تھے اور ہم کو اسی مریض سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ مریضوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر ہمارے پہونچتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنا ہینڈ بیگ لئے ہوئے اس طرح تشریف لائے گویا سینکڑوں مریضوں کو دیکھ کر آرہے ہیں۔ مطب میں آتے ہی آپ نے حیرت سے اس مریض کو دیکھ کر کہا۔ "آپ غالباً وہ مریض ہیں جن کے متعلق میں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ نقل و حرکت نہ کریں؟"

مریض نے کہا:" جی ہاں میں وہی ہوں۔ مگر میں نے آپ کے حکم کی خلاف ورزی اس لئے کی کہ آج مجھ کو یوں بھی اُٹھنا ہی تھا۔ اس لئے کہ ایک مقدمہ کی آج پیشی ہے لہذا میں نے کہا کہ آپ کو بھی دکھا دوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنے چہرہ پر خطرہ کی زنجیر لٹکاتے ہوئے کہا:" مگر جناب

زندگی اور تندرستی سب سے مقدم ہے ۔ بہرحال یہ میرا مشورہ ہے کہ آپ نقل و حرکت نہ کریں ۔ ورنہ جو چیز آج محض ضعف معدہ ہے وہی ترقی کر کے آنتوں کو زخمی کر سکتی ہے اور دوسرے ڈاکٹروں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہو سکتا ہے۔"

مریض نے کہا "میں آئندہ احتیاط رکھوں گا ۔ مگر آج دیکھ لیجئے "

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے دیکھنے میں کوئی عذر نہیں ۔ مگر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لئے کہ نقل و حرکت کے بعد آپ کے تمام نظام میں ہیجانی کیفیت ہوگی اور اس ہیجانی کیفیت میں میں کچھ سمجھ نہ سکوں گا "

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ۔

"چلنے پھرنے سے تو واقعی ضعف معدہ نہایت خطرناک ہو جاتا ہے ۔ اکثر آنتیں اُلٹ جاتی ہیں ۔ اور معدہ کا منہ پھر جاتا ہے "

ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "جی ہاں میرے پاس ابھی چار دن پہلے ایک مریض تھا ۔ اس نے چلنا پھرنا نہیں چھوڑا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف نے پیٹ کی دق کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ اب اسے مہلک ہچکیاں شروع ہو گئی ہے جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں ہے ۔ میں ان کے سلسلے میں اسی لئے ڈرتا ہوں کہ حالانکہ پھر میرے لئے دقت ہو جائے گی کہ وقت نکال کر ان کو دیکھنے جاؤں اس لئے کہ آج کل تو مریضوں کی کثرت کی وجہ سے وقت ہی نہیں ملتا ۔ صبح چھ بجے کا نکلا ہوا ہوں اور اب پھر جا کر غالباً نو دس بجے چھٹی ملے گی ۔ مگر جس طرح بھی ہوگا ان کو دیکھوں گا ۔ مجھ کو تو ان کا علاج کر کے یہ بتانا ہے کہ ذرا سی بات کو یہ ڈاکٹر محض فیس وصول کرنے کے لئے کس قدر خوفناک ثابت کرتے ہیں ۔

آپ کو ذرا سخت قسم کا ضعفِ معدہ ہے اس کو دق تجویز کر دیا ہے ۔

مختصر یہ کہ اس مریض کو ڈاکٹر صاحب نے یوں ہی ٹال دیا ۔ معلوم نہیں کہ پھر اس نے ڈاکٹر صاحب کو گھر پہ بلایا یا نہیں بہر حال اب ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوسی نہیں ہیں ۔ اس لئے کہ مکان دار سے آخر نبھ نہ سکی ۔ اور ڈاکٹر صاحب ایک کم کرایہ کے مکان میں رہنے پر مجبور ہوئے ۔ ان کا مکان اب ایک گلی میں ہے ۔ جس کے دروازہ پر سائن بورڈ مع ڈگری کے لٹک رہا ہے ۔ اور وہ ٹوٹا ہوا موٹر کھڑا ہے جس سے محلے کے بچے کھیلتے ہیں ۔

خدا جنت نصیب کرے

آمدم برسرِ مطلب سے قبل ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک بہت بڑی غلط فہمی کا امکان ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا ناظرین نوٹ کر لیں کہ اس مضمون کی ہیروئن موجودہ شوکت دلہن نہیں بلکہ وہ مرحومہ ہیں جو عرصہ ہوا احسان کر گئیں اور اپنے غریب شوہر کی انشا پردازی کا داغ لئے ہوئے حجلۂ عروسی سے گوشۂ قبر میں منتقل ہو گئیں۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

خدا جنت نصیب کرے، مرحومہ بڑی خوبیوں کی بی بی تھیں۔ شکل و صورت بھی بس یہ کہئے کہ غنیمت تھی، پڑھی لکھی بھی اتنی تھیں کہ راہ نجات اور کریما میں سے دونوں یاد ہوں نہ یاد ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ پڑھی دونوں تھیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آدمی تھیں سمجھ دار اور جانتی تھیں کہ زیادہ لکھنے پڑھنے سے آدمی کی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اس زمانہ میں لکھنا پڑھنا بے کار بھی ہے یہی وجہ تھی ان کو خاص چڑھ اس بات سے تھی کہ یہ خاکسار دفتر میں دماغ کو چرخہ بنانے کے بعد اپنے فرصت کے اوقات میں بھی کتاب کا کیڑا بنا رہے یا لکھتا رہے۔ چنانچہ وہ اس کی خاص احتیاط از راہ شفقت زوجیت رکھتی تھیں کہ ایسا موقع

بھی نہ آنے پائے ہنڈا ہوتا یہ تھا کہ جہاں اس خاکسار نے کوئی کتاب اٹھائی یا قلم ہاتھ میں لیا۔ وہ فوراً اپنے پائینچے سنبھالتی ہوئی تشریف لے آئیں اور ہم نے جیسے ہی کچھ لکھنے کے لئے دماغ میں کوئی پلاٹ تیار کیا۔ انھوں نے فوراً اپنے میکے کے واقعات پڑوسن کے حالات۔ مغلانی کی داستان عشق وغیرہ شروع کر دی اور ہمارا انشاپردازی کا ارادہ جس وقت تک ملتوی نہ کرادیا سر پر سوار رہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ رسائل کے ایڈیٹر صاحبان تقاضے کرنے کے بعد صبر کر چکے تھے۔ انشاپردازی کی تمام امنگیں گھٹ گھٹ کر مر چکی تھیں۔ قلم کا نب زنگ آلود ہو گیا تھا۔ دوات میں روشنائی خشک پڑ گئی تھی۔ کاغذ کا سفید رنگ پڑے پڑے بادامی ہو گیا تھا اور انشاپردازی کا دماغ رفتہ رفتہ مفلوج ہو رہا تھا مگر وہ تو کہئے کہ فطرت کو بر وقت رحم آ گیا اور اس نے ہماری خطرہ میں پڑی ہوئی شوکت تھا نویت کو مرحومہ کے وصل نہیں بلکہ وصال پر ملال سے بال بال بچا لیا ورنہ آج یہ مقالہ سپرد قلم کرنے کے بجائے ہم کسی گراس فارم میں گھاس کھود رہے ہوتے۔

خدا جنت نصیب کرے مرحومہ نے جب بہت ستایا تو ہم نے بھی چوری شروع کر دی اور بجائے دن میں لکھنے کے اپنا دستور یہ کر لیا کہ جب رات کو تمام دنیا سوتی تھی، ہم لکھتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ رات کو دس ساڑھے دس بجے وہ سو گئیں اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب وہ واقعی سو گئیں ہیں۔ ہم چپکے سے اٹھے۔ لالٹین کی بتی تیز کی اور لکھنے لگے۔ اگر مقدر رسیدہ ہوا تو لکھ لیا کچھ ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنے خیال کی دنیا میں ہیں۔ قلم چل رہا ہے۔ کاغذ سیاہ ہو رہا ہے صفحۂ قرطاس پر انشاپرداز کے دماغ سے الفاظ کی شکل میں ادبی اور علمی نکات و

دھوئیں کی بارش ہو رہی ہے۔ آنکھیں کاغذ پر ہیں اور دماغ میں عجیب منظر ہے کہ

"آفتاب کی تیز اور چمکدار شعاعیں بادل میں آکر گم ہو رہی ہیں اور زمین پر

وہ گرم اور روشن شعاعیں نہیں بارش کی ٹھنڈی لطیف اور باریک بوندیں

گر رہی ہیں ـــــ"

یکایک انھوں نے لحاف سے منھ نکال کر ہماری بے خبری اور محویت کے عالم میں کہا:۔

"ارے کیا آپ لکھ رہے ہیں۔"

ہم یکایک چونک پڑے اور اس جنبش سے کاغذ پہ قلم نے ایک بے معنی لکیر

کھینچ دی۔ ہم نے سنبھلتے ہوئے کہا:۔

"ہاں ذرا لکھ رہا تھا میں۔"

انھوں نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ "کیا بجا ہو گا۔"

ہم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک بجنے میں کوئی دس منٹ باقی ہیں ـــ"

انھوں نے محبت سے کہا۔ "اچھا تو اب سو جائیے رات زیادہ آگئی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "بہت ضروری چیز ہے۔ دفتر کا کام اگر نہ کیا تو گئی نوکری ـــ

بیگم صاحبہ نے مجبور لہجہ میں فرمایا:۔

"توبہ ہے اس نوکری سے آدمی کاہے کو بھلا زندہ رہ سکتا ہے ـــ"

ہم نے کہا۔ "اچھا خیر اب سو جائیے آپ ـــ"

بیگم نے کہا۔ "میں تو سو ہی جاؤں گی مگر۔۔۔۔"

ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ "لاحول ولا قوۃ آپ نے دماغ سے سب نکال دیا۔"

بیگم نے برا مان کر کہا۔ "واہ ـــ میں کچھ بولی بھی"

بیگم سوئیں تو نہیں مگر احتجاجاً خاموش ہو گئیں ـــــ مگر اب جو ہم خیالات کو یکجا کرتے ہیں تو بجائے ان خیالات کے ذہن میں صرف یہ آتا ہے ۔

" اس بدمذاق کو ذرا بھی احساس نہیں ـــــ انشا پرداز کو شادی نہ کرنا چاہیئے ـــــ انشا پردازی اور بیوی دونوں آپس میں سَوتیں ہوتی ہیں ـــــ کس وقت لکھا کریں ـــــ یکسوئی اور بیوی دونوں میں سے صرف ایک بیک وقت حاصل ہو سکتی ہے ـــــ ہم رات کو مرغ مکان میں آیا کرتے تھے ـــــ اس وقت کیا آمد تھی اور کیا دماغ کام دیتا تھا ـــــ اس عورت کو زیادہ تر میکے میں رکھا کریں ـــــ "

ان خیالات کو ذہن سے نکالنے میں کچھ کم دیر نہیں لگتی بہ مشکل تمام دماغ کو زبردستی بدشوق لڑکے کی طرح لکھنے پر آمادہ کیا اور " وے پراندش " سے کام لے کر لکھنا شروع کیا :۔

" بارش کی چھما چھم میں باغوں کے جھولے اور جھولوں کے ساتھ اڑتے ہوئے ساریوں کے رنگین آنچل توس قزح کی نقش پیش کر رہے ہیں اور فطرت کے چھیڑے ہوئے اس سال ترنم کی پوری دوشیزگی کے ساتھ ـــــ رم جھم بدریا برسے ـــــ کا نغمہ جسم میں جو کپکپی پیدا کئے ہوئے ہے ۔ شاید اسی کو وجد کہتے ہیں ـــــ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس وقت بھی تم کو یاد نہ کروں ، حالانکہ اس وقت خود کو بھول جانا جس قدر آسان ہے اسی قدر تمھاری یاد کو دل میں نہ آنے دینا دشوار ہے ۔ تم یہ نہ سمجھو کہ یہ میری زیادتی ہے میں دعوئی سے کہتا ہوں کہ اس وقت اگر تم میری

جگہ ہوتے تو تم بھی میری ہی طرح ——"

انھوں نے پھر کہا "آپ سوئے نہیں کیا رات بھر لکھتے ہی جایئے گا۔"

ہم پھر دھک سے ہو گئے' اور چلتے ہوئے قلم نے یکایک رک کر کاغذ پر روشنائی کا ایک آنسو اس حادثہ کی یاد میں ٹپکا دیا ہم نے کہا:۔

بس اب سونے ہی والا ہوں"

میری ہی طرح مجبور ہوتے اور آج بجائے میرے تمھارا قلم مجھ کو مخاطب کر کے یہ الفاظ ——"

بیگم نے کہا "اب ذرا دیر سو بھی رہئے 'سر میں درد ہو جائے گا۔

ہم نے کہا "اس —— تغ —— فر اللہ لیجئے میں نہیں لکھتا"

یہ کہہ کر قلم ایک طرف پھینک دیا۔ اور کاغذوں کا پیڈ دوسری طرف اچھال کر اپنی بوٹیاں اپنے دانتوں سے نوچتے ہوئے لحاف میں گھس گئے۔ ادھر بیگم نے لوریاں دینا شروع کر دیں:۔

آپ لکھئے میں اب نہ بولوں گی' سر کے درد کا مرض ہے' ذرا سی شب بیداری میں درد ہونے لگتا ہے' اسی لئے میں نے کہا تھا میں تو کمبخت ذرا سی بات زبان سے نکال کر گناہگار ہو جایا کرتی ہوں۔ لاکھ لاکھ کہا کہ لکھنا ہے تو دن ہی میں لکھ لیا کیجئے مگر جب لکھیں گے رات ہی میں لکھیں گے ——"

ہم نے لحاف کے اندر ہی سے کہا "غلط کہتی ہو جھوٹ بولتی ہو۔ دن کو بھی تمھاری وجہ سے نہیں لکھ سکتا جب لکھنے کا ارادہ کیا تم سر پر سوار ہو جایا کرتی

ہو۔ اب میں لکھنا ہی چھوڑ دوں گا تاکہ یہ کوفت نہ ہو۔"

بیگم مسلسل تقریر فرما رہی تھیں "میری وجہ سے ایسا ہی خلل ہوتا ہے تو میں کمرے کے باہر رہا کروں گی اور اب تو میں نے کان پکڑے کہ کبھی آپ کی ہمدردی میں بھی کوئی بات نہ کہا کروں گی۔ مہینہ بھر سے برابر چیخ رہی ہوں کہ حکیم صاحب کے یہاں جاکر سر کے درد کے لئے کوئی نسخہ لے آئیے مگر میری سنتا کون ہے اب سے دور ماموں میاں کو بھی سر کے درد نے پریشان کر رکھا تھا۔ انھوں نے حکیم صاحب کا نسخہ کوئی ایک ہفتہ استعمال کیا ہوگا۔ بالکل اچھے ہو گئے۔ مگر یہاں تو مرض پالا جاتا ہے اور پھر طرہ یہ کہ رات رات بھر لکھا جائے گا۔ اور صاحب بولو تو کنا ہگار، آنکھوں کا یہ حال ہے کہ روز بروز چشمہ کا شیشہ موٹا ہوتا جا رہا ہے اور کیوں نہ ہو جب راتوں کو اس طرح جاگ کر لکھائی اور پڑھائی ہو گی تو آنکھوں کی روشنی کہاں سے رہے گی۔ خدا نے دن کام کے لئے اور رات آرام کے لئے بنائی ہے مگر ان کا کارخانہ ہی اُلٹا ہے مجھے ــــ کبھی میں ــــ نے دن کو ــــ رات کر ــــ دفتر ــــ لکھنا ــــ پڑھنا ــــ تو یہ ــــ کان ــــ ناک ــــ انگلی ــــ عینک ــــ آنکھ ــــ دماغ ــــ سوئی ــــ مگر ــــ اگر ــــ"

صبح جو ہماری آنکھ کھلی تو دس بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے۔ خیریت یہ ہوئی کہ آج تعطیل کا دن تھا۔ ورنہ غیر حاضری گویا بطور کمیشن ہوتی۔ ہم کو بیدار دیکھ کر بیگم نے چائے لگا دی اور چائے سے فراغت کے بعد بولیں:۔

"اب آپ غصہ کو تھوک دیجئے اور چلئے تو حکیم صاحب کے پاس تشریف

لے جائیے۔ اس کے بعد آ کر کھانا وانا کھا کے اطمینان سے رات تک لکھیئے۔ جتنا لکھا جائے سمجھے آپ"

ہم نے ایک سعادت مند شوہر کی طرح لفظ بہ لفظ ان کے تمام احکام کی پابندی کی حکیم صاحب کے یہاں بھی گئے اور واپسی پر کھانا بھی کھایا اس کے بعد لکھنے کے لئے بیٹھے بیگم نے حسب وعدہ فوراً کمرہ خالی کر دیا۔ اور ہم کو مضمون نگاری کا پورا پورا موقعہ اس طرح دے دیا کہ اول تو خود بسٹ گئیں، دوسرے خاصدان میں بہت سے پان رکھ گئیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ حقہ کا بھی انتظام فرما دیا جس کے کشوں سے دھوئیں کی چادریں اوڑھ کر الہام خانۂ فطرت سے دماغ میں خیالات آتے ہیں۔ ہم نے اس رئیسانہ ٹھاٹھ کے ساتھ حقہ کے کش لے لے کر پلاٹ سوچنا شروع کیا۔ اور تھوڑی دیر میں اپنے تخیلات کی دنیا میں گم ہو گئے اور اس عالم محویت میں قلم اٹھا کر کاغذ پر "۷۸۶" لکھنے کے بعد مضمون کا عنوان لکھا "طوفان" اس عنوان کے ماتحت ہم جو کچھ لکھنے والے تھے اس کے لئے خیالات کا ایک طوفان ہمارے دماغ میں محدود تخیل تھا۔ لہذا ہم نے لکھنا شروع کیا:۔

"منجم قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں"

آواز آئی "ذرا ایک منٹ کے لئے خلل انداز ہونا چاہتی ہوں ــــ"

"معلوم ہوا کہ ہم کو تخیلات کی دنیا سے اٹھا کر کسی نے اس بری طرح پھینکا ہے۔ کہ ہم ابھی اپنے غریب خانہ میں اس کرسی پر آ کر گرے ہیں۔ جس پر اس وقت تشریف فرما ہیں۔ غصہ تو سخت آیا۔ مگر جب بیوی نے خاصدان میں پان رکھے

حقہ بھر دیا۔ جو عزیب خود رفیقۂ حیات ہونے کے باوجود آج بکمال ایثار ہم کو مضمون نگاری کے لئے تنہا چھوڑ گئی۔ اس مداخلت بیجا کو انگیز کرنا ہی چاہیئے تھا۔ لہذا ہم نے منافقانہ تبسم کے ساتھ کہا:۔

" کہیئے کیا بات ہے "

بیگم نے نسخہ دکھاتے ہوئے کہا " یہ دوائیں تو بھگو لی جائیں گی " اور یہ بیج پیسے جائیں گے۔ ان دو دواؤں کی پوٹلی بنے گی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ باقی دوائیں کیا ہوں گی۔ مثلاً یہ خرفہ کے بیج اور یہ آلو بخارے۔

ہم نے نسخہ ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کی عبارت کو پہلے پڑھنے اور بعد میں سمجھنے کی ناکام کوشش کے بعد اس طرح کہا کہ گویا سمجھ گئے "

یہ بیج پیسے جائیں گے۔ یہ شربت بھگویا جائے گا۔ یہ تمام دوائیں پوٹلی میں ڈال کر اچھال دی جائیں گی۔ اور اس عرق سے دوا کا پیالہ دھو کر صبح تازہ پانی... اس پیالہ میں پلا دیا جائے گا "

بیگم نے غور سے سننے کے بعد کہا۔ " ہٹیئے بھی بیچ بیچ بتایئے ہو گا کیا "

ہم نے نسخہ اچھالتے ہوئے کہا " اسی بدتمیز حکیم سے پوچھو کہ کیا ہو گا۔ میں کیا جانوں "

بیگم نے مایوس ہو کر کہا " تو میں ماموں میاں سے پوچھ لوں "

ہم نے کہا " ہاں ہاں، مجھے بخشو "

بیگم کے جانے کے بعد جو ہم نے اس جملہ پر غور کیا کہ " منجم قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں " تو یہ جملہ حکیم صاحب کے نسخہ سے

کچھ کم پیچیدہ معمہ ثابت نہ ہوا۔ دل چاہا کہ اس جملہ کے آگے حکیم صاحب کا پورا نسخہ نقل کر دیں۔ دماغ میں جو خیالات کا طوفان ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھا تھا اس کا اب کوسوں پتہ نہ تھا، اور سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ہم آخر لکھنے والے کیا تھے۔ تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے یہاں تک کہ سر میں درد شروع ہو گیا اور مجبوراً اسی ایک جملہ پر مضمون کو ختم کر کے سر میں رومال باندھ کر پڑ رہے لیجئے مضمون ختم۔

مگر خدا بہشت نصیب کرے۔ وہ حال اب کہاں، وہ خلوص و ہمدردی، وہ سر کے درد کا خیال اب کون کرے موجودہ ہوم گورنمنٹ کا آئین جہانبانی جداگانہ ہے۔ اب تو یہ ہوتا ہے کہ مضمون لکھو تو لکھنے کے کمرے میں جا کر لکھو، جہاں اگر اتفاق سے قلب کی حرکت بند ہونے لگے تو خلل کے خوف سے شربت کا ایک چمچہ بھی حلق میں ٹپکانے کوئی نہ آئے گا۔ اور اس دوران میں کیا مجال کہ پرندہ بھی پر مار جائے۔ بچوں کا شور و غل، گھر کی چہل پہل سب یک لخت گویا ہڑتال ہو جاتی ہیں اور مضمون زبردستی لکھنا پڑتا ہے خواہ "شعر گفتن" والا مضمون ہو یا "شعر زادن" والا مضمون بیگم صاحبہ کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی اور نہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ سر میں درد اب کس حد تک ہے۔ مختصر یہ کہ وہ وہ کرم مرحومہ یاد آتی ہیں خدا ان کو پہلو بہ پہلو جنت نصیب کرے۔

وغیرہ وغیرہ

میں ایک مقدمہ میں گواہی دینے لاہور جا رہا ہوں - تیزگام مجھ کو نہایت تیزی کے ساتھ کراچی سے دور کرتی چلی جا رہی ہے مگر ناظرین وغیرہ وغیرہ سے ہیں اس وقت بھی قریب تر ہوں اور اسی فراٹے بھرتی تیزگام میں بیٹھا یہ سطریں اس طرح لکھ رہا ہوں کہ ٹرین کی جنبشوں سے قلم صرف اتر سے دکھن ہی کی طرف نہیں چل رہا ہے بلکہ پورب سے پچھم کی طرف بھی چل جاتا ہے اور بعض اوقات تو خط ایسا شکستہ ہو جاتا ہے کہ اپنے اوپر شبہ ہونے لگتا ہے کہ "تھانوی" کے بجائے "تھانیدار" ہو گئے ہیں اور "وغیرہ وغیرہ" کے بجائے پولیس کا روزنامچہ لکھ رہے ہیں جس کو پڑھنے کے لئے بھی اسی کو بلایا جاتا ہے جس نے لکھا ہے خیر کچھ بھی ہو مگر وغیرہ وغیرہ کے ناظرین یہ تو گواہی دیں گے کہ "تیزگام" کی تیز رفتاری اور یہ فاصلہ بھی مجھے ان سے دور نہ رکھ سکا اور ع

فاصلہ جتنا بڑھا اتنے قریب آتے گئے

کراچی اور لاہور کے درمیان چلنے والی تمام ٹرینوں میں سب سے زیادہ نیک نام

یہی تیزگام ہے ہر دو اطراف سے اس کی روانگی اور پہونچنے کے اوقات اس قدر شریفانہ ہیں کہ ان کا سفر برائے نام رہ جاتا ہے اور سفر کی تمام صعوبتیں راتوں رات خواب وخیال بن کر دبے پاؤں گذر جاتی ہیں ۔ کراچی سے تقریباً چار بجے سہ پہر کو ہوا خوری کرانے کے انداز سے مسافروں کو لے کر چلتی ہے اور حیدرآباد سے گذرتے ہی ایسا تھپک تھپک کر سلاتی ہے کہ سندھ کا تمام ریگستان اپنا جلوہ دکھائے بغیر اور اپنی خاک پھنکائے بغیر گذر جاتا ہے اور مسافر جب صبح بیدار ہوتا ہے تو پنجاب کی سرحد شروع ہو چکی ہوتی ہے ناشتہ کرنے ضروریات سے فارغ ہونے اور بستر کرنے میں یہ وقت بھی گذر جاتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے کچھ پہلے ہی لاہور پہونچا دیتی ہے ۔ اس تکلیف دہ اور طویل سفر کو اس سے زیادہ غیر محسوس شاید کسی اور صورت سے نہیں کیا جا سکتا لاہور سے کراچی جانے کے لئے بھی چونکہ یہی اوقات ہیں لہذا مضمون واحد ہی ہوتا ہے ۔

یہ تو ہوئیں تیزگام کی برکتیں اور آسائشیں مگر یہ نیک نام ٹرین ایک معاملہ میں اگر اب تک بدنام نہیں ہوئی ہے تو انشاء اللہ عنقریب سخت بدنام ہو جائیگی اور اس کا پورا نام ہوگا "تیزگام بے طعام" خدا اس ٹرین سے سفر کی اپنے ہر نیک بندے کو توفیق عطا فرمائے مگر ان نیک بندوں کے ان اعمال کو بخشدے جن کی پاداش میں اس ٹرین کا کھانا ان کو کھانا پڑتا ہے ۔ اس "عذاب خوردنی" سے وہ عاقبت اندیش تو بچ جاتے ہیں جو ناشتہ ساتھ لے کر چلتے ہیں ۔ مگر وہ صاحب بہادر قسم کے لوگ نتھنوں چنے چباتے ہیں جو یہ طے کر کے چل پڑتے ہیں کہ

کھانے کی گاڑی تو ساتھ ہوتی ہے اسی میں بیٹھ کر باقاعدہ چھری کانٹے سے گرم کھانا کھائیں گے اسی قسم کے ناعاقبت اندیشوں میں سے ایک میں بھی تھا اور گھر سے ناشتہ نہ لے جانے کی جو سزا میں نے بھگتی ہے وہ دوسروں کے عبرت پکڑنے کے لئے یہاں پیش کئے دیتا ہوں تاکہ وہ بھی میری طرح پکڑے نہ جائیں۔

اس ٹرین کی کھانے کی گاڑی کا جس کو انگریزی میں ریسٹوران کار کہتے ہیں پہلا تجربہ سہ پہر کی چائے کے سلسلہ میں ہوا جب چائے کا پہلا ہی گھونٹ پی کر محسوس یہ ہوا کہ حقے کے پانی میں کالی مرچیں حل کرنے کے بعد دودھ اور شکر ملادی گئی ہے۔ دوسرا گھونٹ اس کو دور کرنے کے لئے پیا۔ اور تیسرے کی ہمت آخر تک نہ ہوسکی۔ بیرے سے لاکھ پوچھا کہ یہ کس جڑی بوٹی کی چائے ہے اور کن امراض کے لئے مفید ہے مگر وہ اس خاندانی نسخہ کا بھید کھولنے کو تیار نہ ہوا۔ اس لئے کہ اس قسم کے نسخے لوگ اپنے ساتھ قبر میں لے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ آج کی سہ پہر بغیر چائے کے بسر کرنا پڑی۔ سوچا کہ رات کو بڑے ٹھاٹھ سے ریسٹوران کار میں پہونچ کر ڈٹ کر کھانا کھائیں گے اور چائے کا بھی انتقام اسی کھانے سے لیں گے وہاں پہونچ کر ایک صاحب کو دیکھا جو پہلے نہ جانے بیرے سے کیا سر کھپاتے رہے اور اس کے بعد منیجر کو طلب فرما کر نہ جانے کیا کیا کہتے رہے آخر میں نے دیکھا یہی کہ یہ نازک مزاج مسافر بغیر کچھ کھائے پئے میز سے اٹھ گیا۔ مگر میں نے چنداں پروا نہ کی اس لئے کہ ہر قوم میں اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور مجھے دراصل یہ کبھی پتہ نہ تھا کہ قصہ کیا ہے آخر بہرصورت

میں نے عشائیہ نہیں بلکہ ڈنر طلب کیا یعنی دیسی نہیں بلکہ انگریزی کھانا اس لئے دیسی کھانا تو گھر پر بھی آخر کھاتے ہی ہیں دوسرے انگریزی کھانے میں ایک خوبی یہ ضرور ہوتی ہے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کھا رہے ہیں وہ دراصل ہے کیا یعنی رنگ روغن سے اصلیت چھپانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

میرے سامنے سب سے پہلے سوپ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کتھے کے پانی پر چوتے کی کچھ چھینٹیں پڑی ہوئی ہیں اعتراض اس لئے نہ کیا کہ بیراگنوار نہ سمجھے دوسرے صورت سے زیادہ دیکھنے کی چیز سیرت ہوتی ہے مگر اس سوپ کا پہلا ہی چمچہ پی کر معلوم ہوا کہ یہ دراصل کتھے کا پانی نہ تھا بلکہ جس پانی میں گوشت دھویا گیا ہے اسی کو گرم کر لیا گیا ہے بہ مشکل اس گھونٹ کو حلق سے اتار کر سوپ ہٹا دیا۔ اس کے بعد مرغی کے کچھ ٹکڑے گاجر کے چند قتلوں اور آلو کی چند قاشوں کے ساتھ پیراکی کی مشق کرتے ہوئے سامنے آئے۔ قاب میں نہایت گندلا شوربہ دیکھ کر سخت وحشت ہوئی۔ مرغی کے ٹکڑے اس قدر سخت تھے کہ چھری جواب دے گئی۔ دانت بیکار ثابت ہوئے اور جی چاہا کہ چند اور مسافروں سے پوچھا جائے کہ کیا آپ کے سامنے بھی یہی بوٹیاں پیش ہوئی تھیں جو آپ نے شاید اسی لئے واپس کر دی تھیں کہ ان کو پانی سے دھو کر ہمارے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ بہرحال ہم نے بھی یہ بوٹیاں اپنے پسماندگان کے لئے چھوڑ دیں۔ مچھلی آئی تو وہ اس قدر باسی تھی کہ یقین ہو گیا کہ یہ طوفانِ نوح کے موقع پر پکڑی گئی تھی اور آج ہمارے معدے کو تاریخی اہمیت دینے کے لئے ہمارے سامنے پیش ہوئی ہے۔ پڈنگ

آنکھ بند کر کے اس لئے نگل لی کہ بہر حال کچھ نہ کچھ کھانا ہی تھا اور آخر کار کافی کو اپنے لئے کافی سمجھ کر پی کر اٹھ آئے اور وہ فارم بھر دیا جس میں کھانا کھانے والے اپنے تاثرات قلم بند کر دیتے ہیں تاکہ ریلوے کے حکام ان تاثرات سے اپنے کو کسی نتیجہ پر پہونچائیں۔ بہر حال ہم اپنی سزا کو پہونچ کر واپس آ گئے۔ اور اب عہد کر چکے ہیں کہ گھر سے ناشتہ لے کر جائیں گے یا پیٹ گھر ہی پر چھوڑ جایا کریں گے اس قسم کی ریسٹوران کاروں کا کیا بھروسہ۔

صبح اٹھ کر ایک اسٹیشن پر چائے پی جو ہر چند کہ تھرڈ کلاس تھی مگر جبڑی بوٹی کی چائے پھر بھی نہ تھی شکر ہے کہ لاہور قریب ہے اور اب گھر پہونچ کر گھریلو کھانا نصیب ہو سکے گا۔

یہ گھڑی نہ چھونا

بچو! یہ نہ کوئی کہانی ہے نہ کسی اور کا قصہ بلکہ یہ خود میرا ہی ایک واقعہ ہے جسے میں نے ان بچوں کو بتانے کے لئے اب تک یاد رکھا ہے جو اب اتنے ہی بڑے ہیں جتنا بڑا میں تھا۔

بچو! بات یہ ہے کہ میں بھی اب سے چالیس بیالیس سال پہلے بالکل تمہارے ہی برابر کا ایک لڑکا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم تو ماشاءاللہ نیک بچے ہو۔ بڑوں کا کہنا مانتے ہو اور کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے تم کو منع کیا جائے مگر میں یوں دیکھنے میں تو بڑا سعادت مند، نیک اور شریف لڑکا تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ تھا بڑا ہی شریر۔ میری بہت سی شرارتیں تو میرے بزرگوں کو معلوم تھیں مگر بہت سی ایسی شرارتیں بھی تھیں جن کو میرے نیک بزرگ نہ سمجھ سکے اور جن کا اُن کو پتہ بھی نہ چلا۔ مگر یہ واقعہ جو آج میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں میری ایسی چوری تھی جس نے مجھ کو گرفتار کروا دیا تھا اور ایسی شرمندگی ہوئی تھی مجھے کہ میں اُسے بھول ہی نہیں سکتا۔

بھئی ہوا یہ ہے کہ ایک دن ابا جان نے گھر میں آکر ہم سب بہن بھائیوں کو

جمع کیا اور سب کو سمجھایا کہ دیکھو میرے ایک دوست کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے وہ یہاں سے جا رہے ہیں مگر ان کا سامان اسی گھر میں رہے گا۔ یہ سب سامان ایک کمرے میں رکھ دیا جائے گا مگر تم میں سے کوئی نہ تو اس کمرے میں جائے نہ اس سامان کو چھوئے۔ پھر امی جان سے کہا کہ آپ بھی ذرا خیال رکھئے گا اس لئے کہ وہ سامان بڑا قیمتی ہے ایسا نہ ہو کہ بچے کسی چیز کو خراب کر دیں۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ سامان ہمارے گھر پہونچ گیا اور ایک کمرے میں رکھا جانے لگا مگر اس سامان میں عجیب عجیب چیزیں تھیں۔ ایک بڑا خوبصورت سا ریڈیو کی طرح کا گراموفون تھا۔ ایک کرسی تھی جس پر بیٹھ کر آدمی ناچ سکتا تھا۔ وہ کرسی خود ہی گھوم جاتی تھی۔ ایک مسہری تھی جس پر سونے سے زیادہ اچھلنے میں مزہ آسکتا تھا۔ ایک گھڑی تھی جس میں ایک خوبصورت سی گڑیا لٹک رہی تھی جو خود بخود ناچتی تھی۔ ابا جان نے امی جان سے کہا کہ یہ گڑیا بس ناچتی ہی رہتی ہے اور جب یہ ناچنا بند کر دے تو سمجھ لو کہ گھڑی کی چابی ختم ہو گئی ہے مطلب یہ کہ بہت سی ایسی چیزیں تھیں۔ ایک سے ایک لاجواب۔ موٹر سائیکل ہے تو ایسی کہ آدمی کا جی چاہے کہ بس اچک کر بیٹھ ہی جاؤ۔ صوفے ہیں تو ایسے کہ ان میں چھوٹے چھوٹے پہئے لگے ہوئے۔ جی چاہتا تھا کہ ان ہی میں سے کسی صوفے پر بیٹھ کر با جی سے کہیں کہ بس چلاتی ہی رہو اس صوفے کو۔

ابا جان نے یہ سامان کمرے میں رکھ کر ایک مرتبہ پھر ہم سب سے کہہ دیا کہ خبردار جو کسی نے اس میں کی کوئی چیز چھوئی۔ یعنی ہم کو اتنی اجازت

بھی نہ تھی کہ اس سامان میں جو ٹائپ رائٹر آیا ہے اُس سے کاغذ پر اپنا نام ہی چھاپ کر دیکھ لیں، جو گراموفون آیا ہے اس پر ایک ہی ریکارڈ لگا کر سُن لیں، جو گھڑی آئی ہے اس کی گڑیا کو ذرا اچکا کر دیکھ لیں۔ مگر مجبوری تھی، کرتے تو کیا کرتے دل مسوس کر رہ گئے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اباجان سو جایا کرتے تھے اور ہم سب کو بھی کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا تاکہ اگر سونا نہ بھی چاہیں تو بھی سونے کی کوشش کرتے رہیں۔ مگر اس دن میں لیٹا ہوا اُن سی تمام چیزوں کے ارمان میں تڑپتا رہا کہ کاش اس کرسی پر بیٹھ کر ناچ سکتا۔ کاش یہ گراموفون سُن سکتا اور کاش اس گھڑی کی گڑیا کو نچا سکتا لیٹے لیٹے خیال آیا کہ اب تو سب سو ہی گئے ہیں۔ اگر اس کمرے میں چپکے سے چلا جائے تو کیا تعجب ہے کہ بہت سے ارمان نکل جائیں۔ چپکے سے اٹھے، جوتیاں ہاتھ میں اٹھائیں۔ پھونک پھونک کر قدم اٹھائے اور دروازہ کھول یہ جا اور وہ جا۔ اب جو پہونچے ہیں اس کمرے میں تو سامنے ہی وہ ناچنے والی کرسی تھی، اُچک کر بیٹھ گئے اور لگے اس کو چکر دینے۔ آہاہا۔ مزہ ہی تو آگیا۔ کرسی سے جی بھر گیا تو موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا ارادہ کیا مگر خیال آیا کہ اگر یہ چل کھڑی ہوئی یا شیطان کے کان بہرے بج گیا اُس کا بھونپو وغیرہ تو نہ جانے کیا ہو۔ لہذا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ٹائپ رائٹر کے حرفوں پر انگلی جو رکھی تو وہ بولا ——— "ٹپ ٹپا ٹپ" اور وہی انگلی دانتوں میں دبا کر ہٹ گئے پیچھے کہ یہ تو سب کو جگا دے گا کم بخت۔ آخر

اس گڑیا والی گھڑی کے پاس پہونچے اور اس کو ادھر اُدھر سے دیکھ کر اس کی پہلی ہی کیل کو گھمایا تھا کہ وہ کم بخت "ٹرررر" کر کے اس زور سے بجتی ہے کہ ہوش اڑ گئے۔ اب اُس سے لاکھ کہتے ہیں کہ خدا کے لئے چپ ہو جا مگر وہ ایک نہیں سنتی "ٹرائے" جاتی ہے۔ ہاتھ اس کے سامنے جوڑے، کان پکڑ کر اس کے سامنے اٹھا بیٹھی کی۔ کرتے کے دامن میں اس کو چھپانا چاہا۔ چمکارا اُسے، خوشامد اس کی کی مگر وہ نہ ماننا تھی نہ مانی اور عین اس وقت جب بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا دیکھتا کیا ہوں کہ دروازے پر والد صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ کہنے لگے — "دیکھ لیا تم نے یہ ہوتا ہے کہنا نہ ماننے کا نتیجہ اور چوریاں اسی طرح کھلتی ہیں۔"

اس شرمندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ حلوہ تک چرانے کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کہیں یہ بھی نہ بول اُٹھے اور اس میں بھی الارم نہ لگا ہو۔

شوکت تھانوی

کے پرلطف مزاحیہ مضامین کے مجموعے اور ناولیں

ناول		مضامین	
عزالہ	Rs. 5/-	مسکراہٹیں	Rs 2/8
خدانخواستہ	" 3/-	برق تبسم	" 3/-
سسرال	" 2/-	شیطان کی ڈائری	1/8/-
کارٹون	" 3/-	گرگٹ	1/8/-
کتیا	" 3/8	نورتن	" 2/8
سپنے	" 3/-	بار خاطر	" 4/-
سوتیا چاہ	" 2/-	مونڈی کاٹے	1/8/-
خانم خاں	" 2/-		
بڑبھس	" 2/-		
معمہ خاتون	" 1/8/-		
بکواس	" 2/8/-		
دل پھینک	" 2/8/-		

